غالب، باندہ اور دیوان محمد علی

صغیر افراہیم

غالب

B
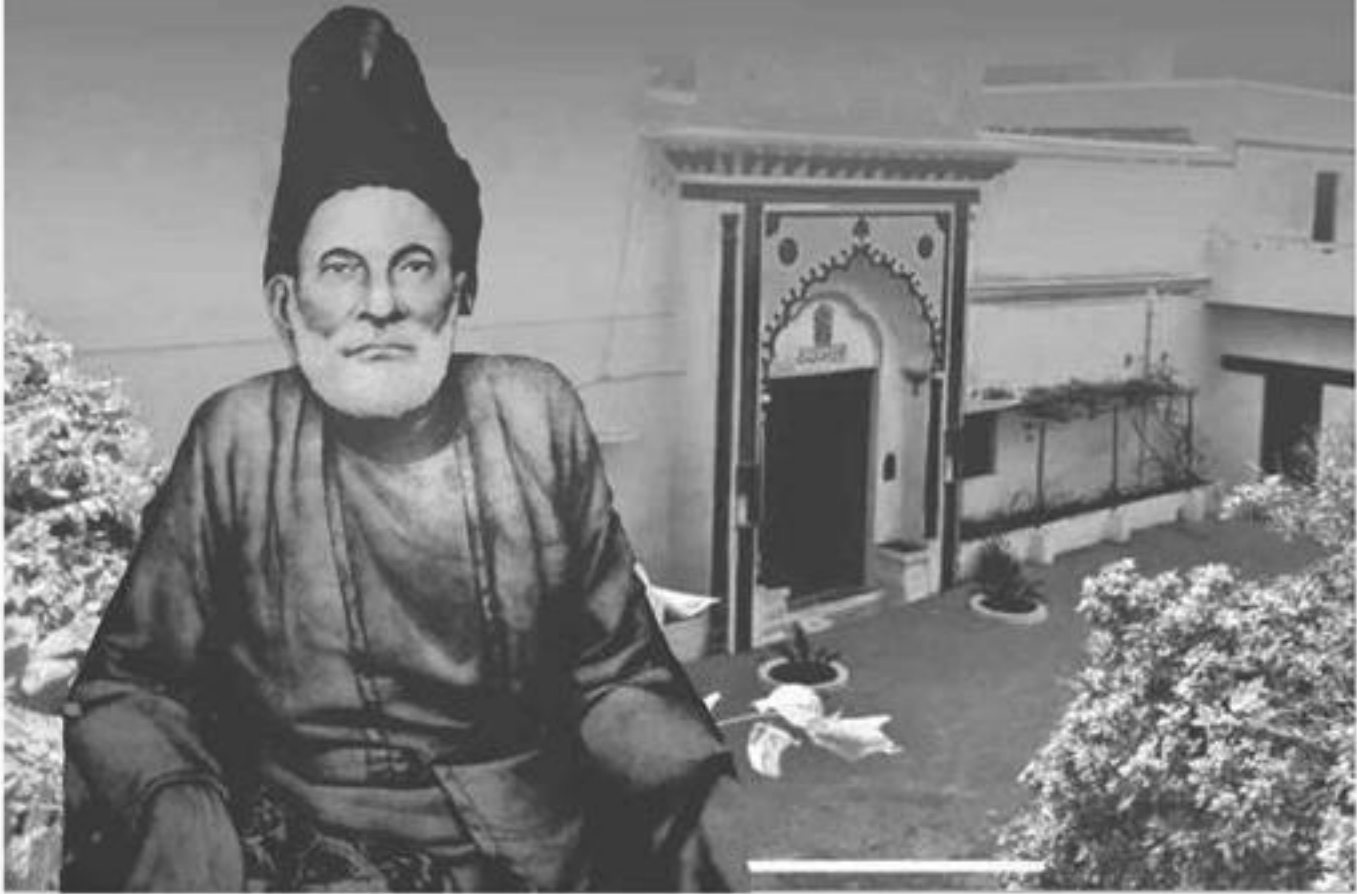
GHALIB, BANDA AUR DIWAN MOHD. ALI

by

Saghir Afraheim

ISBN: 978-93-90167-76-0

ایڈیشن	:	2021
قیمت	:	₹ 400
تعداد	:	500
کاغذ	:	80Gsm سن شائن
مطبع	:	Touchstone، نئی دہلی۔110002
ناشر	:	براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔110025

Circulation & Distribution Office

Brown Books

Opp. Blind School, Qila Road,

Shamshad Market, Aligarh - 202001

Mob: +91 9818897975, Ph: 0571 2700088

E-mail: bbpublication@gmail.com

Website: www.brownbooks.in

انتساب

اپنی شریکِ حیات

پروفیسر **سیما صغیر**

کے نام

جن کی بے پناہ محبتوں نے میرے ادبی سفر کی راہوں کو روشن اور منور کر دیا۔

کھڑے ہوئے: بائیں سے دائیں

عامر مسعود الزماں، شیخ اسعد الزماں، شیخ انور الزماں، عبدالسمیع صدیقی، ڈاکٹر شیخ اشرف الزماں، شیخ ولی الزماں، شیخ ہادی الزماں، صبیحہ خاتون

کرسی پر بیٹھے ہوئے: بائیں سے دائیں

آصفہ خاتون، یاسمین زماں، عائشہ خاتون، عزت النساء، عصمت النساء، مشتاق النساء، بچہ جو درمیان میں کھڑا ہے ممتاز الزماں

عفت النساء (اہلیہ مولانا عبدالماجد دریابادی)، بیگم حامدہ حبیب اللہ، نعمت الرب، سلمیٰ خاتون

فرش پر بیٹھے ہوئے: بائیں سے دائیں

اسماء خاتون، احمد الزماں (طارق) ناہید عطیہ، رومانہ، فوزیہ خاتون، نازش، نکہت فاطمہ

دیوان محمد علی کی نئی نسل کے وارث شیخ سعودالزماں (سعدی) مصنف کے ساتھ

ترتیب

○

تقدمہ

صغیر افراہیم نے اپنی کتاب ''غالبؔ، باندہ اور دیوان محمد علی'' کے پیش لفظ میں جمیل الدین عالیؔ کے حوالہ سے کائناتِ غالبؔ کی وسعت پذیری اور اس پر انجام دیے گئے تحقیقی کام اور افہام وتفہیم کو حرفِ آخر شمار کرنے کے برخلاف، نئے نئے زاویوں اور گوشوں کے انکشاف پر جس تعجب خیزی کا اظہار کیا ہے، وہ کچھ غالبؔ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہر مضمون کے اعاظم رجال کے ساتھ اس علمی وتحقیقی کارفرمائی کا کسی تامل کے بغیر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ہومر، ارسطو، فارابی، ابن سینا، شیکسپیئر، برنارڈ شاہ کسی بھی علم وفن کے کاملین کے بارے میں سیکڑوں برس گزرنے کے باوجود، آئے دن نئے نئے انکشافات اور دریافتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ایک کلیہ کے طور پر یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ تحقیق ہمیشہ جاری رہنے والا ایک عمل ہے، جسے کبھی نہیں ختم ہونا ہے۔

غالبؔ اقلیم سخن کا تاجدار ہے۔ اردو شاعری پر اس کی حکمرانی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اس کی شاعرانہ عظمت، دوسرے اردو شعراء کی طرح کسی ایک وصفِ خاص اور کسی ایک صنف خاص تک محدود نہیں ہے۔ بہت سے سخنوروں کی شاعری کے امتیاز میں صرف نظم کا شمار کیا جاتا ہے، غزل کے شعراء جن کے یہاں محض مضامین حسن وعشق ادا کیے گئے ہیں۔ بعض شعراء کو قصیدہ نگاری میں خصوصیت حاصل ہے تو بعض رثائی شاعری میں یگانہ ہیں۔ کسی کے یہاں تصوف مابہ الامتیاز ہے تو کوئی مثنوی میں فرد ہے، کسی کے یہاں فکر وفلسفہ ہے تو کسی کے یہاں قومی یا وطنی شاعری ہے۔ ان کا مطالعہ انہی مخصوص موضوعات کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں وسعت وتنوع کا وہ بڑا اظہار نہیں ہے جو کسی شاعر کو تخیل کی فراوانی اور مختلف الجہات حیثیتوں کی وجہ سے رفعت ومنزلت کا درجہ عطا کرتا ہے۔

غالبؔ ایک ایسا شاعر ہے جو ذہن و خیال کی کسی ایک سمت میں بند نہیں ہے۔اس کے یہاں تفکر و تخیل کی پرواز اور شعری اصناف کا ایسا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے جسے پڑھ کر نہ صرف فرحت اور تازگی محسوس ہوتی ہے، بلکہ زندگی کی وہ حقیقتیں سامنے آتی ہیں جن سے ہمیں مفر نہیں ہے اور جو ہمارے دامن سے لپٹی ہوئی ہیں۔غالبؔ نے زندگی کو جس طرح قریب سے دیکھا اور برتا ہے اور جس قدر تلخ و شیریں اور خوشگوار و زہرناک تجربوں سے وہ گزرا ہے، ان سب کو اس نے شعری پیرہن میں اس خوبصورتی سے ڈھالا ہے کہ ایک معمولی آدمی سے لے کر بڑے سے بڑے ذی رتبہ کے لیے اس میں مسرت اور دلچسپی کا سامان ہے۔

غالبؔ بلا کا ذہین اور حساس طبع تھا۔اس کی تیز نظر اور قوت مشاہدہ نگاری سے وہ باتیں چھپی نہیں رہیں، جو ایک عام آدمی کی نگاہ سے اوجھل رہتی ہیں۔ذکاوت، درّاکی اور دور بینی اس کی شاعری میں معکوس ہے۔وہ زندگی کے ہر موڑ اور خوشی و غم کے ہر مرحلہ میں ہمارا ساتھ دیتا نظر آتا ہے۔کسی بھی موقع و محل کے لحاظ سے ہم اس کے یہاں مضمون تلاش کر لیتے ہیں۔یہ غالبؔ کی ایسی بڑی خوبی ہے، جو دوسرے شاعروں کے یہاں اس طرح دکھائی نہیں دیتی۔اسی لیے اس کا کلام کبھی 'بے رنگ' نہیں ہوگا اور ہمیشہ اسے قدر اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔اس کے اشعار فرحت و شادمانی سے سرشار کرتے رہیں گے۔اور ان کے نئے نئے معانی و مفاہیم سامنے آئیں گے۔

غالبؔ کا جن شخصیتوں اور شہروں سے تعلق رہا ہے، ان پر اردو محققین نے بڑی تلاش و تحقیق سے کافی مواد فراہم کیا ہے۔شہروں میں جہاں کلکتہ، مرشد آباد، بنارس، الٰہ آباد، باندہ، آگرہ، بھوپال، حیدرآباد، بدایوں، رامپور، الور، راجستھان اور ہریانہ کے حوالہ سے کتابیں شائع ہوئی ہیں، وہاں متعلقہ اشخاص بیدلؔ، قتیلؔ، میاں داد خاں سیاحؔ، سرورؔ، وحشتؔ، آغا محمد حسین ناخداؔ، غمگینؔ، تفتہؔ، صفیرؔ بلگرامی جیسے شناسانِ غالبؔ، تحقیق کا موضوع رہے ہیں۔

غالبؔ کی جان کو جو مسئلہ زندگی بھر لگا رہا اور جس سے وہ کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکے اور مسلسل پریشاں اور سرگرداں رہے، وہ پنشن کا قضیہ ہے۔لیکن اس قضیہ نامرضیہ سے اُبھرنے والے کچھ ایسے عنوان بھی ہیں، جنھوں نے ان کی نارسائیوں کے باوجود، ان کی شخصیت میں گیرائی و گہرائی

اور ان کے فکروفن میں روشنی اور جلاء پیدا کی ہے۔اس قضیہ کے وہ دلچسپ حادثے اور ادبی پہلو جواس کے سبب، کلکتہ کے سفر میں، مختلف شہروں میں پیش آئے اور اس دوران بیماری، امید وبیم، مالی پریشانیوں، رقابتوں، مخالفتوں، ناخوشگوار اور خوشگوار صورتوں سے جس طرح وہ گزرے، محققین کے لیے شروع سے تحقیق کا موضوع رہے۔

کلکتہ کا ادبی معرکہ بجائے خود ان کی زندگی کا ایک اہم عنوان ہے۔اگر یہ سفر در پیش نہ آتا تو ان بہت سے شہروں میں انھیں جانے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ خاص کر کلکتہ جہاں ایک نئی دنیا اور سائنس کی جدید ترقیات وایجادات کے مشاہدہ کا انھیں موقع ملا۔علاوہ ازیں دوسرے شہروں کی ممتاز شخصیتوں سے ملاقاتوں، تجربوں اور ان شہروں کے حسن و جمال نے غالبؔ کے احساسات وخیالات میں جو رنگینی ورعنائی پیدا کی، وہ دہلی اور آس پاس کی بستیوں کے قیام سے ان کے ذہن ودماغ میں نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔

غالبؔ اس قضیہ کی دادرسی کے لیے چارلس مٹکاف سے ملاقات کی خاطر دہلی سے کانپور گئے۔ وہاں پہنچتے ہی بیمار پڑ گئے۔ معقول علاج اور مناسب طبیب نہ ملنے پر لکھنؤ جانا ضروری سمجھا۔لکھنؤ یونانی طب کا دہلی کے بعد دوسرا سب سے بڑا مرکز تھا۔ بڑے گرامی منزلت حاذق طبیب وہاں موجود تھے۔لکھنؤ میں پانچ مہینہ سے زیادہ قیام رہا۔انھیں معتمد الدولہ آغا میر سے مالی معاونت کی امید تھی۔آغا میر کے نام ایک عرض داشت تیار کی تھی اور ان کی مدح میں ۱۱۰/اشعار کا قصیدہ بھی لکھا تھا، مگر آغا میر کے رویہ نے انھیں دل برداشتہ کیا اور انھوں نے وہ دونوں تحریریں آغا میر کو نہیں پیش کیں۔وہ آغا میر سے اس قدر ناراض ہوئے کہ جہاں پہلے ان کے لیے کہا تھا۔

لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید
جادۂ رہ، کشش کاف کرم ہے ہم کو

وہاں انھیں ''نو دولتیہ'' کہہ کر ان کی تحقیر میں کوئی کمی نہیں کی۔انھوں نے معتمد الدولہ کی شان میں جو قصیدہ کہا تھا، اس کی ایک نقل نواب باندہ کو دی تھی، بعد میں اُنھیں ڈر لگا کہ یہ قصیدہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ پڑ جائے۔ چنانچہ اس کی حفاظت کے لیے انھیں خط لکھا۔ غالبؔ

نے یہی قصیدہ ہمایوں جاہ، نواب مرشد آباد کے نام کرنا چاہا۔ اور آخر میں اس قصیدہ کے ممدوح نواب نصیر الدولہ قرار پائے۔

لکھنؤ سے وہ ۲۱/جون ۱۸۲۷ء کو باندہ کے لیے کانپور روانہ ہوئے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے یہ واضح کیا ہے کہ غالبؔ نے لکھنؤ سے باندہ کے لیے پُروا، موراواں کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے نیوتنی والا راستہ اختیار کیا اور کانپور آئے۔ کانپور میں مختصر قیام کے بعد باندہ گئے۔ کلکتہ کے بعد باندہ وہ جگہ ہے جہاں غالبؔ کا سب سے زیادہ تقریباً ۶ مہینے قیام رہا۔

باندہ جانے کی اصل وجہ نواب باندہ، ذوالفقار علی خاں سے ملاقات اور وہاں رہ کر بیماری کا علاج اور کلکتہ کے سفر کے اخراجات کے لیے مناسب رقم کی فراہمی تھی۔ نواب ذوالفقار علی خاں سے غالبؔ کی کچھ رشتہ داری بھی نکلتی تھی۔ غالبؔ کی ممانی نواب ذوالفقار علی خاں کی سگی خالہ تھیں، اس سے سوا یہ کہ وہ غالبؔ کے دودھ شریک بھائی بھی ہوتے تھے۔ غالبؔ نے اپنی ممانی اور ذوالفقار علی خاں نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا۔ باندہ میں ممانی کے بیٹے یعنی غالبؔ کے دوسرے دودھ شریک بھائی مرزا اوزبک خاں بھی موجود تھے۔ یہ رشتہ بھی ان کے سفر باندہ کا ایک محرک تھا۔ اوزبک خاں سے یقیناً قیام باندہ میں غالبؔ کو سہولت ملی ہوگی۔ نواب ذوالفقار علی خاں کا خاندان صاحبِ حیثیت اور صاحبِ ثروت تھا۔ ان کی تباہ حال حویلی کے کھنڈر سے آج بھی ان کی امارت کا نشان ملتا ہے۔

باندہ کے زمانہ قیام میں غالبؔ کے مرض بول الدم کا علاج رہا۔ بول الدم کو غالبؔ پر لکھنے والے تقریباً سبھی حضرات نے بشمول خلیق انجم ''بوالدم'' لکھا ہے، جب کہ یہ لفظ بول الدم ہے۔ بول بمعنی پیشاب اور دم بمعنی خون۔ یہاں میں ایک بحث چھیڑنا نہیں چاہتا، میرا یہ خیال یقین کی حد تک ہے کہ دراصل غالبؔ کو سوداوی یا اور کوئی مرض نہیں تھا۔ انھوں نے ڈومنی یا زنان بازار میں کسی سے آتشک کا آزار لگالیا تھا۔ اس ایک طرح سے لاعلاج مرض میں وہ آخر عمر تک، اس کی اور اس سے متعلقہ شکایات وعوارضات کا شکار رہے۔ ان کی ساری تکلیفیں اسی مرض کی دین تھیں۔

باندہ کے ادبی وشعری حلقے غالبؔ کے طویل قیام سے، ظاہر ہے بے خبر نہیں رہے ہوں گے۔ وہ اگر چہ بیمار تھے، مگر ایسے معذور بھی نہ تھے کہ کسی تقریب یا شعری محفل میں شرکت نہ

کر سکیں۔ وہاں کے عام شائقینِ ادب کے حوالہ سے اگر چہ تفصیل نہیں ملتی، لیکن نواب ذوالفقار علی خاں، رئیس باندہ کے تعلق سے تفصیلی طور پر اور دیوان ریاست (وزیر) محمد علی خاں کے حوالہ سے مختصر اُاطلاعات فراہم ہیں۔ یہ تفصیلات بھی سید اکبر علی ترمذی کے کلکتہ سے دیوان محمد علی کے نام لکھے گئے دریافت شدہ خطوط سے پہلے دستیاب نہیں تھیں۔ ''نامہ ہائے فارسی غالبؔ'' کی شکل میں ترمذی کی مساعی سے ادبی دنیا پہلی مرتبہ ان سے متعارف ہوئی۔

محمد مشتاق شارق کے مضمون ''غالبؔ اور بندیل کھنڈ'' مشمولہ سہ ماہی رسالہ تحریر، نئی دہلی (مدیر مالک رام) شمارہ اپریل تا جون ۱۹۷۷ء اور صالحہ بیگم قریشی کی کتاب ''باندہ اور غالبؔ'' (۱۹۹۴ء) سے باندہ کے سفر، وہاں کے قیام اور نواب باندہ سے تعلق کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ غالبؔ اور کلکتہ، غالبؔ اور بنارس، غالبؔ اور الہ آباد جیسی کتابیں بھی ان شہروں کی روئداد پیش کرتی ہیں۔

باندہ میں غالبؔ کی وہاں کے ایک ذی علم اور ذی ثروت دیوان محمد علی (وفات ۱۸۳۱ء) سے ملاقات دراصل اِس سفر کے حاصلات میں ہے۔ ادبی و شعری نیرنگیوں کے علاوہ مالی لحاظ سے بھی یہ ملاقات، ان کے لیے ہر طرح بہت سود مند رہی۔ صغیر افراہیم نے اپنی تحقیق میں یہ ثابت کیا ہے کہ دیوان محمد علی بلند ادبی ذوق کے حامل تھے۔ فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ فارسی کے علاوہ ان کی انگریزی لیاقت بھی اچھی تھی۔ باندہ سے پہلے وہ لکھنؤ میں انگریزی ملازمت میں تھے اور انگریزی حکومت سے وظیفہ پاتے تھے۔ انگریزی حکومت نے ہی انھیں باندہ میں تعینات کیا تھا۔ غالبؔ اور ان کی عمر میں اگر چہ بڑا تفاوت تھا۔ غالبؔ ۲۹ ؍برس کے اور وہ پچپن کے قریب کے بزرگ تھے، مگر وہ غالبؔ کے مداح و قدرداں تھے۔ انھوں نے غالبؔ کی آڑے وقت میں مالی معاونت کی۔ اور کلکتہ میں بھی دو مرتبہ دو دو سو روپیہ بھیج کر ان کی مالی پریشانیوں کو کم کیا۔ صغیر افراہیم نے صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دیوان محمد علی سے تعلق خاطر ہی کی بناء پر غالبؔ کا باندہ میں اتنا عرصہ قیام رہا۔ ورنہ وہ شاید اتنی مدت وہاں نہ ٹھہرتے۔

غالبؔ سے ان کی قربت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صرف ساڑھے تین برس کی مختصر مدت میں ان کے نام غالبؔ کے لکھے ہوئے ۳۷ ؍خط اب تک دریافت ہو چکے ہیں۔ مزید

کی گنجائش اپنی جگہ ہے۔ دیوان محمد علی کے تعلق سے کلکتہ میں بھی غالبؔ کو فائدہ پہنچا۔ محمد علی کے بڑے بھائی کلکتہ میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے۔ گو کہ وہ غالبؔ کے کلکتہ پہنچنے سے قبل وفات پا چکے تھے، لیکن دیوان محمد علی نے اپنی بھاوج کے نام تعارفی خط دیا تھا، جس کو لے کر غالبؔ ان سے ملے۔

غالبؔ کی دیوان محمد علی سے شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشی و رنج کی خبر سے انھیں مطلع کرتے تھے۔ ان کے نام غالبؔ کے ارسال کردہ خطوط اگر ضائع ہو جاتے تو وہ بہت سی باتیں سامنے نہیں آ سکتی تھیں، جو ان کی دریافت و اشاعت کے بعد ادبی دنیا کے علم میں آئیں۔ غالبؔ نے مرزا یوسف کی صحت وری اور خود ان کے ہاتھ کے لکھے خط سے اپنی خوشی میں محمد علی کو مثل عزیزوں کے شریک کیا اور تفصیل سے اس کے بارے میں لکھ کر اپنی شادمانی کا اظہار کیا۔ خلیق انجم کی کتاب ''غالبؔ کے سفر کلکتہ'' میں ۴۰ جگہ دیوان محمد علی کا ضمنی ذکر آیا ہے۔

باندہ میں بعض دوسرے اصحاب کے علاوہ میر کرم علی نام کے ایک صاحب بھی غالبؔ کے دوست بن گئے تھے۔ باندہ سے یہ غالبؔ کے تعلق خاص ہی کی بات تھی کہ کلکتہ سے دہلی واپسی پر بھی انھوں نے باندہ کا سفر اختیار کیا۔ جب کہ باندہ دہلی کے راستہ میں نہیں، سمت مخالف میں واقع تھا۔

باندہ سے براہ الٰہ آباد و بنارس، کلکتہ کے سفر کی پہلی منزل مودھا تھی۔ مودھا کو ڈاکٹر شہناز نبی اور بعض دیگر نے مونڈہ لکھا ہے۔ مودھا، باندہ کا ایک مسلم آبادی والا قصبہ ہے۔ یہاں میں اپنے قلم کو اس اظہار سے روک نہیں پا رہا ہوں کہ شعبہ علم الادویہ، اجمل خاں طبیبہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے میرے ایک ساتھی حکیم رفیق الدین مرحوم کا تعلق اسی قصبہ سے تھا۔ ان سے مودھا کا تذکرہ اس کے نام کی وجہ سے کچھ تفریح و تفنن کے طور پر رہتا تھا۔ میں انھیں چھیڑتا تھا کہ غالبؔ کی وجہ سے مودھا جیسا قصبہ معتبر بن کر اردو ادب کی تاریخ میں محفوظ ہو گیا ہے۔ وہ تجارہ کا کہتے کہ غالبؔ کے خط میں مہاراجہ الور کی ایک مشایعت کے حوالہ سے تجارہ کا نام صفحۂ قرطاس پر آیا ہے۔

محمد علی کے نام غالبؔ کے خطوط سے باندہ سے کلکتہ کے سفر اور راستہ کے احوال و کوائف ہی نہیں معلوم ہوتے، قیام کلکتہ میں وہاں کے مشاعروں میں غالبؔ کی شرکت، ان پر کیے جانے

والے اعتراضات اور مخالفتوں ورقابتوں کی بھی اطلاع ملتی ہے۔ سفر کلکتہ کے تعلق سے یہ غالبؔ کی اطلاعات کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ غالبؔ میں دشنام طرازی کا جو مادہ تھا، وہ کلکتہ میں قتیلؔ اور اس کے ہمنواؤں کے سلسلہ میں کھل کر سامنے آیا ہے۔ انھوں نے الٰہ آباد کے خرابہ پر بھی لعنت بھیجی ہے اور اس شہر کو برباد اور صحن جہنم اور شہریوں کو روسیاہ لکھا ہے۔ وہاں انھیں ایک دن ٹھہرنا بھی مشکل ہوا، جب کہ بنارس میں وہ ایک مہینہ رہے۔ بنارس کی بادہ جانفزا، سبزہ وگل، پری چہرہ حسینوں کی جلوہ طرازیوں سے اُنھیں تاب وتوانائی ملی۔ ایک خط میں اس کو بہارستان اور بہشت کا ہم پلہ، شاہد رنگین قبا اور جلوہ گاہ حسن کہا ہے۔

کلکتہ کا سفر غالبؔ کے تذکرہ میں ایک بہت اہم عنوان ہے۔ تین ہزار کلومیٹر کے اس پورے سفر میں باندہ کی آسائشوں کے علاوہ بنارس کے فرحت بخش منظر اور اس کی رومان پرور فضا، یا کلکتہ کی بتان خودآرا کے دیدار کے سوا، غالبؔ کو بیماری، صعوبت اور صبر آزما کرب ناکیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ بعض لوگوں کے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ کلکتہ کے سفر نے غالبؔ کے فکروفن، تخیل وشعور اور پرواز ذہن پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں کیا ہے۔

خلیق انجم کی کتاب ''غالبؔ کا سفر کلکتہ اور کلکتہ کا ادبی معرکہ'' اس سلسلہ کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں الٰہ آباد اور بنارس کے ساتھ باندہ کے تعلق سے بھی کچھ باتیں درج ہیں۔ میں نے اس کتاب پر ایک بہت تفصیلی تبصرہ کیا تھا۔ اس کا اقتباس اس کتابچہ میں شامل ہے جو اس کتاب پر ''اردو دانشوروں کی رائے'' (تبصروں کے اقتباسات) کے نام سے غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر شہناز نبی کی کتاب غالبؔ اور کلکتہ ۱۹۹۹ء اور شاہد ماہلی کی کتاب غالبؔ اور کلکتہ (۲۰۱۰ء) میں بھی اس سلسلہ کے مضامین شامل ہیں۔

غالبؔ کے کلکتہ کے اس پورے سفر میں صغیر افراہیم کی تحقیق کی بدولت دیوان محمد علی کا کردار بہت خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اب وہ ایک ایسی اہم شخصیت کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں جنھوں نے نہ صرف قیام باندہ میں غالبؔ کو ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائیں، بلکہ کلکتہ میں بھی ان کا دست عطا غالبؔ کا سہارا بنا۔ اِس باندہ کے تعلق سے سب سے پہلے سید اکبر علی ترمذی کی دریافت (Persian Letters of Ghalib 1969) ''نامہ ہائے فارسی غالبؔ'' اور پھر لطیف الزماں

خاں، پرتو روہیلہ، جمیل جالبی اور خلیق انجم نے ڈیڑھ سو برس پُرانے بند دروازہ کو کھولا ہے۔لیکن لکھنؤ سے باندہ کے سفر، پھر باندہ میں قیام اور غالبؔ کے مخلص دیوان محمد علی کے حوالہ سے معلومات فراہم نہیں کی گئی تھیں۔صغیر افراہیم نے اس کتاب (غالبؔ، باندہ اور دیوان محمد علی) میں ان کو موضوع بنا کر، ان کے تعلق سے اہم معلومات پیش کی ہیں۔

صغیر افراہیم نے مذکورہ کتاب کے پہلے باب میں باندہ کی تاریخ اور جغرافیہ پر مدلّل لکھا ہے، دوسرے اور تیسرے باب میں سفر کلکتہ کے اسباب وعلل، آمدہ باندہ اور انتخاب راہ پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے اس کے لیے صالحہ بیگم کی تالیف سے مواد کے حصول کا اپنے پیش لفظ میں اعتراف ضرور کیا ہے لیکن کچھ وضاحتوں اور شواہد کے ساتھ جن کا اعتراف خود مصنفہ نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں کیا ہے۔

۱۹۹۰ء میں باندہ میں صغیر افراہیم کی شادی کے بعد اُنھیں اس سلسلہ کی اور زیادہ معلومات حاصل ہوئیں۔پیش نظر کتاب کا اصل حصہ دیوان محمد علی کے احوال وکوائف سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے حالات سے جیسا کہ صغیر افراہیم نے لکھا ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے کہ شناسانِ غالبؔ کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتے تھے۔اس کتاب کے ذریعہ صغیر افراہیم نے اس خلا کو پُر کیا ہے اور اُن مکتوبات کا معروضی مطالعہ پیش کیا ہے جو غالبؔ نے دیوان محمد علی کو لکھے ہیں۔اس اہم مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیوان محمد علی، غالبؔ کے ایک ایسے ممدوح اور مکتوب الیہ ہیں جنھیں غالبؔ نے محض تین ساڑھے تین برس کی قلیل مدت میں ۳۷/خط لکھے ہیں۔

دیوان محمد علی کو لکھے گئے مکتوبات کے معروضی مطالعہ اور احوال وافکار کے علاوہ صغیر افراہیم نے ایک اچھا کام یہ بھی کیا ہے کہ باندہ کے تعلق سے غالبؔ کا شعری سرمایہ ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔اس میں فارسی اشعار زیادہ ہیں لیکن اردو غزلیں بھی شامل ہیں۔ان میں غالبؔ کی وہ غزل بھی ہے جس کا پہلا شعر ہے ؎

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو، تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اس غزل کے تین اور مشہور شعر ہیں ؎

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش ! جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ ''یہ بے ننگ ونام ہے''
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کتاب کا ایک دلچسپ اور نہایت مؤثر باب ''یادوں کی بازیافت: باندہ، غالبؔ اور متعلقین'' کے عنوان سے ہے۔ اس کے شروع میں صغیر افراہیم نے بزرگ خواتین کی کہانیاں سُنانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ تہذیب اُس زمانہ کے شرفاء کے گھروں میں عام تھی۔ بھوپال میں میری نانی صفیہ بیگم جن کا ۹۲ ربرس کی عمر میں ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوا، ہم بچوں کو اسی طرح کی کہانیاں سناتی تھیں اور سب بچے ان کی مسہری اور پاس کی مسہریوں میں لیٹے لیٹے کہانیاں سنتے سنتے سو جاتے تھے۔ صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

> ''گھر میں قصہ کہانی سُننے سُنانے کا ماحول تھا۔ اردو کے اخبار ورسائل پابندی سے آتے تھے جو پڑھے اور سُنائے جاتے تھے۔ اس ماحول میں، میں نے غالبؔ کے تعلق سے بھی کہانیاں سُنیں، جن کا مرکز ومحور باندہ ہوا کرتا تھا۔ ایسا اس لیے کہ تقسیمِ ہند سے قبل میرے ایک بُزرگ سید محمد افراہیم شاہ مویشیوں کے ڈاکٹر (Veterinary doctor) کی حیثیت سے باندہ میں تعینات تھے۔ دادی صاحبہ (زوجۂ ڈاکٹر سید محمد افراہیم شاہ) جن کا میکا فتح پور ہسوا تھا، وہ اناؤ (سسرال) سے باندہ کے سفر کو بڑے دلچسپ واقعات کے ساتھ بیان کرتیں۔ خاص طور سے موضع چلّہ تارہ کے پاس دریائے جمنا اور دریائے کین کے اتصال پر بنے

پیپے/ ناؤ کے پُل سے گُزرنے کا ذکر وہ ہر بار کچھ اس حیران کُن انداز میں کرتیں کہ سند بادی کہانیاں یاد آ جاتیں۔ جب کبھی ہم اُن سے دریافت کرتے کہ سمندر جیسے پاٹ کو جہاں چاروں طرف پانی ہی پانی ہو، آپ پیپے یا ناؤ سے بنے پُل سے گزرتے ہوئے گھبراتی نہیں تھیں؟ تو دادی صاحبہ فرماتیں سوچو غالبؔ نے سوسوا سو سال پہلے اس کو کس طرح پار کیا ہوگا؟''۔

کتاب میں ایک اہتمام یہ بھی ہے کہ ہر باب کے آخر میں حواشی کا ذکر کیا گیا ہے۔اس سے نیز فہرستِ کتابیات سے مصنف کی کاوش اور مواد کے حصول میں ان کی تگ ودو کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ صغیر افراہیم کی اِس تحقیقی کتاب (غالبؔ، باندہ اور دیوان محمد علی) کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوگی۔

پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن

ابن سینا اکاڈمی، تجارہ ہاؤس
دودھ پور، علی گڑھ

۱۳/اکتوبر ۲۰۲۰ء

دیباچہ

صغیر افراہیم صاحب نے چند برسوں کے اندر تدریس، ادبی تنقید و تاریخ اور تحقیق کی دنیا میں وہ شہرت کمائی ہے جو عمر بھر کی ریاضت کے بعد بھی بہتوں کے ہاتھ نہیں آتی۔ اِس کا بہت بڑا سبب اُن کی ذہانت، شرافت اور معلّمی کے پیشے سے اُن کے مزاج کی فطری مناسبت ہے۔ میں ایک حد تک اُن کی ذاتی زندگی سے بھی واقف ہوں، اُن کے والد اور اہل خاندان سے بھی۔ صغیر صاحب کو یہ شرافت، نیکی اور نرم مزاجی اپنے ماحول سے بھی ملی ہے۔ ورنہ تو یونیورسٹی کی فضا میں اِن دنوں جو آپا دھاپی مچی ہوئی ہے اور معلّمی کے نام پر جو کاروبار جاری ہے، اس سے ایک دنیا واقف ہے۔

صغیر افراہیم کی علمی سرگرمیاں کسی دائرے کی پابند نہیں، ہر چند کہ افسانے کی صنف، ان کی پہلی ترجیح ہے اور اپنے معاصر افسانہ نگاروں پر وہ گہری نظر رکھتے ہیں۔ فکشن پر ان کا کام مقبول ہوا ہے۔ لیکن ادب کی نئی پُرانی صنفوں سے بھی وہ تقریباً یکساں شغف رکھتے ہیں۔ اپنے ہم عصروں کے حلقے میں وہ غیر مُتنازع رہے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور جس موضوع کی طرف مائل ہوتے ہیں، اس پر محنت کرتے ہیں۔ حصول علم کے راستے میں اگر عاجزی، انکساری اور بُردباری بھی ساتھ ہو تو آدمی بے قابو نہیں ہوتا ہے۔

اِدھر اُن کے موضوعات میں تنوع اور وسعت کا احساس بھی خوب ہوتا ہے۔ پریم چند، جگت موہن لال رواںؔ، سرسید، علی گڑھ اور اب غالبؔ پر اُن کی یہ کتاب غالبؔ سے اُن کی گہری دلچسپی کا پتہ دیتی ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے یہ ایک تحقیقی کتاب ہے۔ خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ صغیر افراہیم نے غالبؔ کے مطالعات میں اپنی اس کتاب (غالبؔ، باندہ اور دیوان محمد علی) کے

واسطے سے ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے، نئی اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ خلیق انجم نے غالبؔ کے سفر کلکتہ کے بارے میں جو کتاب مرتب کی تھی، اس کی پذیرائی ہوئی۔ وہ ایک دلچسپ کتاب ہے ہر چند کہ ہمارے عہد کے نامور محقق حنیف نقوی صاحب نے خلیق انجم کے دریافت کردہ بعض نتائج پر شک کی نظر ڈالی ہے۔

اس کتاب میں صغیر افراہیم نے اپنے آپ کو بہت مرکوز رکھا ہے۔ غالبؔ کے سفرِ کلکتہ کا تمام وکمال اِحاطہ کرنے کے بجائے، اس سفر کے دوران راستے میں ایک چھوٹی سی بستی باندہ میں غالبؔ کے طویل قیام اور پھر اس قیام کی تفصیلات کو نئے سرے سے جاننے، پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنی اِس کوشش میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ باندہ کے سفر کے لیے انتخابِ راہ، قیام، فضا، ماحول، ثقافتی اور جغرافیائی صورتِ حال کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ نیز دیوان محمد علی کے شجرۂ حسب ونسب کو پیش کرتے ہوئے ایک اہم خلا کو پُر کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ دونوں کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ غالبؔ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشی ورنج کی خبر سے دیوان محمد علی کو مثل اپنے بزرگ عزیز مطلع کرتے اور اُن کے مشوروں پر عمل کرتے تھے۔

باندہ شہر سے صغیر افراہیم کا کچھ ذاتی رشتہ بھی ہے۔ اس رشتے کی ڈور پکڑے ہوئے وہ غالبؔ اور عہد غالبؔ تک جا پہنچے ہیں۔ اُن کی اہلیہ پروفیسر سیما صغیر کا وطن باندہ ہے اور باندہ کے جس گھرانے سے اُن کا تعلق ہے، اس کی حیثیت بہت ممتاز رہی ہے، غالبؔ کے زمانے سے لے کر اب تک۔ اس طرح گھر بیٹھے بہت سی معلومات صغیر افراہیم کے ہاتھ آ گئیں۔ انھوں نے اس کتاب سے متعلق سارا مواد جدید طریقِ کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑی دلجمعی کے ساتھ مرتب کیا ہے، خصوصاً غالبؔ اور دیوان محمد علی کے تعلق سے۔

پروفیسر صغیر افراہیم کے اِس تحقیقی کام کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ غالبؔ کے مطالعے کا شوق ڈیڑھ سو برس گزر جانے کے بعد بھی کم نہیں ہوا ہے۔ اردو اور فارسی کے اساتذہ غالبؔ کی زندگی اور سوانح، یا نثر اور نظم میں کوئی نہ کوئی نیا نکتہ دریافت کر ہی لیتے ہیں۔ غالبؔ اور عہد غالب سے نسبت رکھنے والی کوئی نہ کوئی حقیقت ڈھونڈھ ہی لی جاتی ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ کچھ عرصہ پہلے غالبؔ اکادمی نے غالبؔ کے غیر متداول کلام کا ایک نیا مجموعہ، جمال عبدالواجد کا مرتب

کیا ہوا شائع کیا تھا۔کیسی قیمتی کتاب ہے، نسخہ حمیدیہ پر ایک وقیع اضافہ! ۔اسی طرح صغیر افراہیم نے سفر کلکتہ کے تعلق سے باندہ کے ضمنی ذکر کو ایسی وسعت عطا کردی ہے کہ اب اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ علمی حلقوں میں صغیر افراہیم کی یہ کتاب نہایت شوق سے پڑھی جائے گی۔ اقبالؔ کے لفظوں میں یہ دعا بھی ہے کہ **''اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے''** اور صغیر صاحب کی تلاش و تحقیق، تجزیے اور تنقید کا یہ سلسلہ جاری رہے، اس کی رسائی نئی منزلوں تک ہوتی رہے۔

شمیم حنفی
۲۰/ستمبر ۲۰۲۰ء
ذاکر باغ، نئی دہلی

دیوان محمد علی اور غالبؔ کے نشست و برخاست کے کمرے

مقدمہ

ہندوستانی ادبیات کی تخلیقی ثروت مندی، کائناتی تعینات میں مستور تضاد آگیں حقیقت کے عرفان، ثقافتی، لسانی اور فنی تنوع اور مرتعش حسیاتی شعور کی صورت گری میں غالبؔ کا نام سرفہرست ہے۔ کالی داس، تلسی داس، کبیر داس، امیر خسرو اور ٹیگور کی طرح غالبؔ ملک کی ذہنی زرخیزی اور دانشورانہ قوت (Soft Power) کو خاطر نشان کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ غالبؔ کا متن گزشتہ پونے دوسو سال سے مسلسل مطالعہ کا ہدف بنا ہوا ہے اور ان کی شاعری ہمارے اجتماعی شعور کا حصہ بن گئی ہے۔ ان کی شاعری کے مرتکز آمیز تنقیدی مطالعات تواتر کے ساتھ اشاعت پذیر ہوتے رہتے ہیں اور غالبؔ کے احباب اور ان سے متعلق دیگر شخصیات کو بھی تحقیق کا مرکز بنایا جاتا ہے۔ غالبؔ کی اردو اور فارسی شاعری اور نثری نگارشات، علی الخصوص خطوط سے متعلق کتابیں اور مضامین کثرت سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر بیشتر تحریریں کسی نئے خیال انگیز تجزیے یا نئے تحقیقی تناظر کی نشاندہی نہیں کرتیں۔ سطحی اور سرسری تشریح اور پامال اور فرسودہ خیالات سے آباد تحریروں کی کثرت نے غالبؔ کو ایک صنعت (Industry) کی صورت میں منقلب کر دیا ہے۔ غالبؔ پر لکھنے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافے نے غالبؔ کے تنقیدی اور تحقیقی محاسبہ کی راہ کھوٹی کر دی ہے۔ کتابوں کی بہتات کثرت تعبیر کا کسی بھی سطح پر اثبات نہیں کرتی۔

غالبؔ کے خطوط ان کی غیر معمولی اختراعی قوت رسمی طرز اظہار سے شعوری انحراف اور شخصی روابط کو ایک خیال انگیز مکالمے کی صورت میں اجاگر کرنے کی روش کو خاطر نشان کرتے ہیں۔ غالبؔ کے خطوط کو بارہا موضوع تحقیق بنایا گیا ہے اور ان تمام اشخاص کے سوانحی کوائف اور ادبی

اکتسابات کو مرکز مطالعہ بنایا گیا ہے جو غالبؔ کے مکتوب الیہ ہیں یا ان کا ذکر خطوط میں کیا گیا ہے۔ اہم محققینِ غالبؔ میں امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، مالک رام، حنیف نقوی، کالی داس گپتا رضا، مشفق خواجہ، مختارالدین احمد آرزو، خلیق انجم، کاظم علی خاں اور شمس بدایونی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ تحقیق کے واجبات بہت شدید ہوتے ہیں لہٰذا پی ایچ. ڈی. کے تحقیقی مقالے (جن میں تحقیق کو ضمنی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور مختلف کتابوں کے اقتباسات کی Paraphrasing کر کے دادِ تحقیق دی جاتی ہے) کے علاوہ کسی شاعر یا ادیب کو گہری اور عالمانہ تحقیق کا موضوع کم ہی بنایا جاتا ہے۔ اگر ماضی کے کسی اہم شاعر کی سوانح یا ان کے احباب سے متعلق معلومات تشنہ ہیں اور معروف محققوں نے اس باب میں خاموشی اختیار کر رکھی ہے تو ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی معروف ناقد اپنے مطالعے کا آغاز فراموش کردہ حقیقت کی نقاب کشائی کو اپنا محور و مرکز بنائے اور تحقیق کی دشوار گزار راہوں پر گامزن ہو اور بطور محقق اپنا انفرادی تشخص قائم کرنے کی سعی کرے۔

مقام مسرت ہے کہ فکشن کے معروف ناقد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق سربراہ پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنی اولین تحقیقی کاوش غالب کے فارسی خطوط پر مرکوز کی ہے اور غالبؔ کے ایک ایسے مکتوب الیہ کا تفصیلی ذکر مستند تحقیقی شواہد کے ساتھ کیا ہے جن سے متعلق اطلاعات کا افسوسناک حد تک فقدان ہے۔ غالبؔ نے سفر کلکتہ کے دوران باندہ میں چھ ماہ قیام کیا اور ان کے میزبان دیوان محمد علی تھے جن کے نام ان کے 37 فارسی خطوط ہیں۔ ان خطوط سے منکشف ہوتا ہے کہ غالبؔ دیوان محمد علی کو کس درجہ عزیز رکھتے تھے اور دیوان محمد علی نے غالبؔ کی اعانت کی اور کلکتہ میں پینشن کی حصولی میں ان کی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ دیوان محمد علی نے کلکتے میں اقامت پذیر اپنے قریبی بارسوخ اعزا کو خطوط لکھے اور ان کے قیام وغیرہ کا بندوبست بھی کرایا۔ دیوان محمد علی کے سوانحی کمالات، ادبی اکتسابات اور غالبؔ سے ان کے غایت تعلق کو اب تک تحقیقی ارتکاز کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے دیوان محمد علی کے حالات زندگی، ملازمت، شعری کمالات اور ان سے متعلق دیگر معلومات کو معروضی طور پر جرح و تعدیل کے عمل سے گذار کر تحقیقی دقتِ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے اولاً دیوان محمد علی کا صحیح نام لکھا کہ زیادہ تر محققوں نے دیوان محمد علی کو دیوان محمد علی خاں لکھا ہے۔ دیوان کی اصطلاح دراصل وزیر کے

لئے استعمال کی جاتی تھی۔ صغیر افراہیم نے دیوان محمد علی کے سندیلہ اور اناؤ سے سے نسبی تعلق کے مستند شواہد پیش کئے اور یہ انکشاف بھی کیا کہ اردو کے صاحبِ طرز ادیب اور انشاء پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲ء-۱۹۷۷ء) کا سسرالی تعلق دیوان محمد علی سے تھا۔

گیارہ مختصر ابواب میں منقسم اور ۱۴۰ صفحات پر مشتمل کتاب ''غالب، باندہ اور دیوان محمد علی'' واقعتاً غالبؔ کے ایک غیر معروف ممدوح دیوان محمد علی کی شخصیت کو پوری شرح وبسط کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ صغیر افراہیم نے غالبؔ سے متعلق تحقیقی کتابوں میں مندرج نکات کی تلخیص اور پیرائیہ اسلوب میں معمولی سی تبدیلی کے ساتھ نئے پہلوؤں پر مبنی تحقیق پیش کرنے کا پُر شور دعویٰ نہیں کیا بلکہ پوری سنجیدگی اور علمی متانت کے ساتھ تحقیقِ غالبؔ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

دیوان محمد علی سے محققین غالبؔ کی بے اعتنائی یقیناً حیرت خیز اور تاسف انگیز ہے کہ غالبؔ نے جن افراد کے ساتھ مراسلت کی تھی ان تمام افراد کی پوری تفصیل غالبؔ سے متعلق کتابوں میں درج ہے مگر دیوان محمد علی سے متعلق اطلاعات کا یکسر فقدان ہے اور زیادہ تر لوگ دیوان محمد علی کو نواب باندہ سے Confuse کرتے ہیں۔ مصنف نے اس غلط فہمی اور تحقیقی تساہلی کا ازالہ کرنے کے لیے غالبؔ کے سفر باندہ اور یہاں ان کے قیام کی جزئیات پر توجہ مرکوز کی۔ انہوں نے کتاب کی ابتدا ایک اہم سوال سے کی ہے:

> ''غالبؔ کی وفات کے سو سال بعد تک یہی ذکر ہوتا رہا کہ وہ عین جوانی میں 'جوں توں'، 'گرتے پڑتے' باندہ پہنچ گئے مگر اس پر توجہ نہیں دی گئی کہ موصوف لکھنؤ سے باندہ کیسے، کس طرح پہنچے؟ میرے نزدیک اس خطہ (لکھنؤ سے باندہ) کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس یادگار سفر کلکتہ کی وجہ سے غالبؔ کے دو نئے دوست بنے، ان میں دیوان محمد علی اور مولوی سراج الدین کا تعلق اسی خطے سے تھا۔ غالبؔ نے دونوں حضرات کو فارسی میں سب سے زیادہ خطوط لکھے ہیں (محمد علی کو ۳۷ اور سراج الدین احمد کو لکھے گئے ۵۲ خط دستیاب ہیں)۔ یہ خطوط رسمی نہیں، محبت اور یگانگت کے سر چشمے ہیں۔ تو پھر اس اہم نکتے پر مدلل گفتگو کیوں نہیں ہوئی؟ اس پہلو کے

ساتھ ساتھ میں نے زمینی حقائق کی روشنی میں وہ تاریخی اور جغرافیائی شواہد
بھی تلاش کیے ہیں جو مکمل سفر کو سمجھنے میں مزید معاون ہوں گے۔"

دیوان محمد علی کے تئیں چشم پوشی کیوں روا رکھی گئی؟ اس ضمن میں مصنف کی یہ دلیل بڑی حد تک مسکت ہے کہ غالبؔ کی حیات میں ان کے فارسی خطوط کا جو مجموعہ شائع ہوا اُس میں محمد علی کے نام صرف آٹھ خطوط کو شامل کیا گیا تھا۔ یہ خطوط مکتوب الیہ یا قیام باندہ سے متعلق اہم نکات کے بیان سے بڑی حد تک عاری تھے۔ دیوان محمد علی کا انتقال بھی ۱۸۳۱ء میں ہو گیا اور ان سے متعلق تفصیلات محققین غالبؔ کے پیش نظر نہیں تھیں اور نہ یہ کوشش کی گئی کہ مکتوب الیہ کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں، تبحر علمی اور شعری اظہار پر قدرت کو تفصیلی مطالعہ کا موضوع بنایا جائے۔
پروفیسر صغیر افراہیم نے غالبؔ کے ان فارسی خطوط کو موضوع بحث بنایا ہے جن پر گفتگو کم کی گئی۔

غالبؔ کے خطوط محض مراسلے کو مکالمہ بنانے کی روش کے غماز نہیں ہیں بلکہ غالبؔ کی آرزو مندیوں اور ان کی شخصیت کی پیچیدگیوں اور تحفظات اور تعصبات کے بھی آئینہ دار ہیں۔ غالبؔ نے تیس بتیس برس کی عمر میں فارسی میں خطوط لکھے تھے اور ان میں بھی ایک جہانِ معنی آباد ہے اور مکتوب الیہ بھی مختلف شعبہ ہائے حیات سے متعلق ہیں۔ موضوعاتی تنوع اور پیرائیہ اظہار کی ندرت انہیں اردو خطوط (جن کی مقبولیت میں کلام نہیں) سے الگ شناخت عطا کرتی ہے۔

پروفیسر صغیر افراہیم کی کتاب نہ صرف دیوان محمد علی سے متعلق معلومات کے فقدان کو تحقیقی دقتِ نظری کے ساتھ پورا کرتی ہے بلکہ غالبؔ کے قیام لکھنؤ، کانپور اور باندہ سے متعلق دستیاب تفصیلات کو Cross Check بھی کرتی ہے اور بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرتی ہے۔ دیوان محمد علی کمپنی کے ملازم تھے، نواب باندہ سے ان کے مراسم تھے، غالبؔ سے ان کی ملاقات کی تفصیل نہ تو مالک رام نے درج کی ہے اور نہ خلیق انجم نے۔ دونوں نے عمومی باتیں لکھیں۔ اس سلسلے میں صغیر افراہیم نے اہم تاریخی ماخذوں کو کھنگالا اور حتمی طور پر لکھا:

"غالبؔ ۲۷ر جون ۱۸۲۷ء (۲۶ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ) بروز جمعہ علی الصباح
لکھنؤ کو الوداع کہتے ہیں اور ۲۹ر جون بروز اتوار کانپور پہنچتے ہیں۔ ایک
دن کانپور اور ایک دن فتح پور میں قیام کرتے ہوئے ۲ر جولائی کی رات

کے آخری پہر باندہ پہنچتے ہیں۔ تعمیر ہو رہی عمارت کے پاس کچھ وقت
گزارتے ہیں اور صبح دیوان محمد علی، صدر امین، باندہ اپنی کوٹھی میں ان کا
استقبال کرتے ہیں۔"

دیوان محمد علی سے متعلق تفصیلات جمع کرنا آسان نہیں تھا مگر صغیر افراہیم نے تحقیقی جاں فشانی کا ثبوت دیتے ہوئے غالب کے ایک اہم مگر گمنام مکتوب الیہ کے بارے میں خاصی معلومات جمع کر دی ہیں۔ دیوان محمد علی خود بھی شاعر تھے مگر ان کا کلام ہنوز دریافت نہیں ہوا ہے۔ مصنف اس ضمن میں بھی کوشاں ہیں۔

یہ کتاب مصنف کی تحقیقی دیانتداری اور دوسروں کے اعتراف کمال کی کمیاب صفت کو بھی آشکار کرتی ہے کہ غالب کے فارسی خطوط کو انگریزی اور اردو میں منتقل کرنے والے ادیبوں سید اکبر علی ترمذی، پرتو روہیلہ اور لطیف الزماں خاں پر الگ الگ ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ سید اکبر علی ترمذی نے غالب کے ان فارسی خطوط کو بھی دریافت کیا جو پنج آہنگ میں شامل نہیں تھے اور ان سے غالب کی بعض شخصی کمزوریوں، جن کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے، سے متعلق غلط فہمیوں کا تدارک ہوتا ہے۔ صغیر افراہیم نے بجا طور پر لکھا ہے:

"جب تک سید علی ترمذی کے توسط سے غالب کے مزید خطوط قارئین کے
سامنے نہیں آئے تھے تو ناقدین باندہ کی امداد و ضیافت کے تعلق سے
بالواسطہ طور پر یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ غالب موقع پرست، مطلبی اور
احسان فراموش تھے، لیکن تلاش جدید نے یہ ثابت کر دیا کہ غالب مطلب
براری کے لئے ضمیر کے خلاف کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے بلکہ خود کو احسان
کے بوجھ تلے محسوس کرتے اور محسن کو ہمیشہ یاد رکھتے۔ اس کا بین ثبوت
کلکتہ سے واپسی کے سفر میں، راستے سے دور، سمت مخالف میں، صرف اور
صرف دیوان محمد علی کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے باندہ پہنچنا ہے۔ ان کا
یہ منکسرانہ، مخلصانہ اور بے لوث عمل بھی ان کے قول و فعل اور عادات و
اطوار کو عیاں کرتا ہے۔ اس طرح خطوط غالب بنام محمد علی، مکتوب نگار اور

مکتوب الیہ کے جذبات کے پاس ولحاظ کے ساتھ ساتھ شہر باندہ اور وہاں
کی ادبی ہلچل کے بھی ضامن بنتے ہیں۔"

صغیر افراہیم نے غالبؔ کے قیام باندہ کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ اولاً ان فارسی خطوط کا ذکر کیا ہے جو غالبؔ نے یہاں رہ کر سپرد قلم کیے اور ان کی بعض غزلوں کا بھی ذکر کیا جو سکونتِ باندہ کی رہین منت ہیں۔ ایک علیحدہ باب 'باندہ کے تعلق سے غالبؔ کا شعری سرمایہ' میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ تاہم یہ غزلیں قیام باندہ کے دوران ہی لکھی گئی ہیں، اس کا کوئی متعین حوالہ نہیں ہے۔ مصنف نے صرف یہ لکھا ہے:

"میں یہاں صرف اردو غزلوں کا ذکر کروں گا جن پر بیشتر محققین متفق ہیں کہ یہ غزلیں قیام باندہ یا پھر سفر باندہ کی دین ہیں۔" مصنف کے نزدیک "آبرو کیا ہے خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں + ہے گریباں ننگ پیراہن، جو دامن میں نہیں" غالبؔ کی ایک مشہور غزل "ستائش گر ہے زاہد جس قدر باغ رضواں کا" الخ، مصنف کے نزدیک غالبؔ نے باندہ پہنچتے ہی لکھی۔ علاوہ بریں ایک معروف غزل "ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے" الخ کو بھی قیام باندہ کی رہین منت ٹھہرایا گیا ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے اس ضمن میں مزید لکھا ہے:

"اس غزل کے تعلق سے جس کا مطلع ہے نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے، رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے، روایت مشہور ہے کہ یہ غزل قیام باندہ کے دوران لکھنی شروع ہوئی تھی لیکن غالبؔ نے اس طویل غزل کو بعد میں مکمل کیا۔ یہ استدلال کمزور اور غیر متعین ہے۔ سال اور ماہ کی نشاندہی کے ساتھ ان محققوں کی عبارت درج کی جانی چاہیے تھی جنھوں نے مذکورہ بالا غزلوں کو سکونت باندہ کی رہین منت قرار دیا تھا۔ غالبؔ کی ایک مشہور غزل "حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں" کو بعض محققین نے دیوان محمد علی اور نواب باندہ سے منسوب کیا ہے۔ اس سلسلے میں صغیر افراہیم نے اس دعوے کی تردید کی اور تحقیقی شواہد کے ساتھ لکھا:

"یہ غزل نہ تو دیوان محمد علی کی حیات میں لکھی گئی اور نہ ہی نواب باندہ کی

زندگی میں، بلکہ ذوالفقار علی کی وفات کے بعد ۱۸۴۹ء میں نواب علی بہادر علی کے مسند نشین ہونے کے بعد قلم بند کی گئی۔"

پروفیسر صغیر افراہیم فکشن مطالعات، علی الخصوص پریم چند سے متعلق تنقیدی تجزیے کے باعث ملک میں معروف ہیں اور اب وہ اس کتاب کی وساطت سے میدان تحقیق میں داخل ہوئے ہیں۔مندرجات کی معروضیت، تحقیقی استدلال، مقدمات کی تدوین اور نتائج کے استخراج میں تحقیقی دقتِ نظری کے باعث یہ کتاب (غالبؔ، باندہ اور دیوان محمد علی) ممتاز ادیب اور معروف نقاد صغیر افراہیم کو ذمہ دار محققوں کی صف میں شامل کر دیتی ہے جس کی پذیرائی لازمی ہے۔

شافع قدوائی
پروفیسر وصدر شعبۂ ترسیل عامہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Shafeykidwai@gmail.com

دیوان محمد علی کے گھر کا وہ اندرونی حصہ جہاں غالبؔ بیٹھا کرتے تھے

پیش لفظ

غالبؔ کی شخصیت کو آفاقیت عطا کرنے میں اُن کی شاعری اور مکاتیبِ اسلوب کے تہہ بہ تہہ مطالب کی کارفرمائیاں شامل ہیں۔ غالبؔ شناس ان دانش ورانہ نِکات کو مزید وسعت دے رہے ہیں، اور ایک ایک نُطق کو سو سو ناز سے سجا رہے ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں جمیل الدین عالیؔ، پرتوؔ روہیلہ کی کتاب ''بارے غالبؔ کا کچھ بیاں ہو جائے'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''غالبؔ شناسی اور مطالعۂ غالبؔ ایک ایسی کائنات ہے کہ ایڈنگٹن اور اسٹیفن ہاکنگ کی ''کائنات'' کی طرح برابر وسعت پذیر ہو رہی ہے۔ ہر مرحلے پر خیال آتا ہے کہ شاید یہ کام یا یہ تحقیق غالبؔ پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہو لیکن پھر کوئی غالبؔ شناس خم ٹھونک کر میدان میں آ جاتا ہے کہ ''یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا'' اور غالبؔ شناسی کا ایک آدھ در اِس طرح وا کر دیتا ہے کہ اس میں نئی کرنوں کی درآمد کے ساتھ ساتھ غالبؔ کے خدوخال بھی نئے زاویوں سے نمایاں ہونے لگتے ہیں''۔

غالبؔ کی شخصیت، فکروفن کے ہزار ہا گوشوں میں ایک گوشہ سفرِ کلکتہ بھی اِس لیے اہم قرار دیا گیا ہے کہ یہ ہمارے ادبی، سماجی اور ثقافتی فروغ میں معاون ثابت ہوا ہے۔ جب جب اِس مَسافت کے تعلق سے میں باندہ کے ذکر پر غور کرتا تو نہ جانے کیوں ذہن میں کئی سوالات اُبھرنے لگتے۔ مثلاً باندہ سے مرزا کا کیا رشتہ اور رابطہ تھا؟ وہ منزل سے مختلف راستے (off the way) پر کیوں گئے؟ سفر سے پہلے اور سفر کے بعد باندہ والوں سے اُن کا کیا تعلق رہا؟ وہاں چھ ماہ کے قیام میں اُن کی کیا مشغولیات رہیں؟ محفلیں کس وسیلے سے سجتیں، شب و روز کیسے گزرتے؟ مقامی

ادیبوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ وہاں کی پروان چڑھ رہی گنگا جمنی تہذیب میں کیا نکھار آیا؟ دورانِ قیام مہیا ہونے والے پُرسکون ماحول میں غالبؔ نے فارسی اور اردو نثر و نظم میں کیا خلق کیا؟ کیا وہ تمام تخلیقات محفوظ ہیں؟ اگر نہیں تو اُس کے اسباب کیا ہیں؟ کتنی نگارشات گم شدہ ہیں اور ان کی تلاش و جستجو کی کیا رفتار ہے؟ یہ وہ چھوٹے چھوٹے سوالات ہیں جنھوں نے تحیّر و تجسّس کو مہمیز کیا کہ دورانِ سفر کانپور اور لکھنؤ میں قیام کی تفصیل موجود ہے۔ الہٰ آباد جس کے لیے غالبؔ کہہ کر چلے تھے کہ ایک ماہ قیام کروں گا مگر رہے صرف ایک دن۔ اسی طرح بنارس میں دو ایک دن ٹھہرنا تھا، ایک ماہ مقیم رہے۔ اِن شہروں کی روداد اور تاثرات بالتفصیل دستیاب ہیں مگر جہاں چھ ماہ قیام کیا، وہاں کے شب و روز کی تفصیل سے ہم محروم کیوں ہیں؟ یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جنھوں نے اِس جانب توجہ دلائی اور تفتیش و تحقیق پر اُکسایا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی غالبؔ کو احساس ہوا کہ ورثے میں جو معاشی اور مادّی سہولتیں مہیّا ہونی تھیں اُن پر غاصبانہ قبضہ ہوا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے جائز حق کے لیے تگ و دو کرتے ہیں ورنہ وہ بھی دیگر عزیزوں کی طرح غمِ روزگار کے مشکل مرحلوں کے مادّی اسباب تلاش کرتے۔ ساہوکاروں نے بھی تمام عمر اُنھیں اِسی بھروسہ پر قرض دیا کہ اُن کا حق سرکار سے اُنھیں ملنے والا ہے۔ کشش و پنچ کی اس کیفیت کے ساتھ ساتھ گھریلو مصائب نے ذہنی تناؤ میں مزید اضافہ کیا مگر وہ تمام عمر صبر و تحمّل کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اُن میں بھی ابنِ آدم کی طرح انسانی کمزوریاں تھیں لیکن غیر معمولی دانش وری، بذلہ سنجی، خداداد صلاحیت، قوتِ مدافعت اور فن کارانہ مہارت نے انسانی کمزوریوں کو پسِ پشت ڈال دیا۔

غالبؔ بے حد حسّاس، نازک مزاج، خوددار اور انا پسند انسان تھے۔ اُن کی عظمت کا اعتراف حاکمانِ وقت نے بھی کیا ہے۔ اب اگر کسی کو ان کے یہاں دُنیاداری یا مصلحت پسندی نظر آتی ہے تو یقیناً اُس کے پسِ پُشت کوئی بڑی مجبوری رہی ہوگی، ورنہ اپنے مخصوص رکھ رکھاؤ کو برقرار رکھنے والے اِس اعتدال پسند شخص نے خودداری اور انا کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا چاہے وہ دربارِ اودھ میں حاضری کی بات ہو، نواب باندہ کا معاملاتِ مقدمہ سے بے توجہی یا پھر دلّی کالج کی پروفیسری کا معاملہ۔ جن ناقدین نے نفسیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ بھی اِس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ معیار و مقام کو برقرار رکھنے والا یہ شخص مطلبی، احسان فراموش، کینہ پرور یا حاسد نہیں تھا۔

غالبؔ کی وفات کے سو سال بعد تک یہی ذکر ہوتا رہا کہ وہ عین جوانی میں ''جُوں توں''، ''گرتے پڑتے'' باندہ پہنچ گئے۔ مگر اِس پر توجہ نہیں دی گئی کہ موصوف لکھنؤ سے باندہ کیسے، کس طرح پہنچے؟ میرے نزدیک اِس خطّہ (لکھنؤ سے باندہ) کی بڑی اہمیت ہے کہ اِس یادگار سفرِ کلکتہ کی وجہ سے غالبؔ کے جو نئے دوست بنے اُن میں دیوان محمد علی اور مولوی سراج الدین احمد کا تعلق اِسی خطّے سے تھا۔ غالبؔ نے دونوں حضرات کو فارسی میں سب سے زیادہ خطوط لکھے ہیں (محمد علی کو ۳۷/اور سراج الدین احمد کو لکھے گئے ۵۲/خط دستیاب ہیں)۔ یہ خطوط رسمی نہیں، محبت اور یگانگت کے سرچشمے ہیں۔ تو پھر اس اہم نکتہ پر مدلّل گفتگو کیوں نہیں ہوئی؟ اِس پہلو کے ساتھ ساتھ میں نے زمینی حقائق کی روشنی میں، وہ تاریخی اور جغرافیائی شواہد بھی تلاش کیے ہیں جو مکمل سفر کو سمجھنے میں مزید معاون ہوں گے۔

۱۹۶۹ء میں عالمی سطح پر منعقد ہونے والی غالبؔ تقریبات کے بعد سید اکبر علی ترمذی کی تلاش وجستجو کی بدولت رفتہ رفتہ جو تحریریں خصوصاً فارسی خطوط سامنے آئے ہیں اُن سے باندہ سے کلکتہ تک کی تفصیلی روداد معلوم ہوتی ہے مگر جس فردِ واحد کے توسط سے یہ منظر نامہ اُبھرا، اُس کی شخصیت اور غالبؔ جیسے انا پرست فنکار کی اُن سے بے پناہ اُنسیت پر بھرپور توجہ نہیں دی گئی ہے۔ مشکل گھڑی میں کام آنے والی اِس مقناطیسی شخصیت کا نام ہے دیوان محمد علی جنھیں غالبؔ نے نہایت تعظیم وتکریم اور عجز وانکسار کے ساتھ مولوی محمد علی خاں (صدر امین باندہ) کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ دونوں کی پہلے سے کوئی شناسائی نہیں تھی لیکن کج کُلاہ شاعر اُن کے آبائی وطن سے ہوتے ہوئے آرہا تھا۔ شاید مٹی کی مہک کی یہ کشش اپنی جانب راغب کرتی ہے۔

غالبؔ پہلی ہی ملاقات میں محمد علی کے کیوں گرویدہ ہوگئے؟ اور محمد علی نے کیوں مشفقانہ اور مربیانہ رویّہ اختیار کیا؟ بلکہ کلکتہ میں بھی اپنے عزیزوں اور اُن کے دوستوں مثلاً سراج علی خاں، مولوی سید ولایت حسن، نواب سید اکبر علی خاں طباطبائی، نورالدین علی وغیرہ کو غالبؔ کی ممکن مدد کے لیے خطوط لکھے اور برابر خبر گیری کرتے رہے۔ غالبؔ کی بھی دوستی اور وضع داری دیکھیے کہ احسانات کا شکریہ ادا کرنے کے لیے واپسی پر باندہ میں اُن کے دولت کدہ پر قیام کرتے ہیں۔

پنشن کی بحالی کے یقین اور ناکامی کے عارضی احساس کی کسک کے مابین شہر باندہ کا منظر

نامہ، نا اُمیدی میں اُمید کی کرنوں کو روشن کرتا ہے۔ اِس میں نہ صرف پیش آئند سفر کے اخراجات کی فکر، بیماری کی اذیت، شفا کے ساتھ مالی مدد کی مسرت ہے بلکہ مشفق، مربی اور قدرداں علم دوست ملنے کی خوشی کا شدید احساس بھی ہے۔ رابطوں کی کڑیوں کو ہی نہیں بلکہ دلوں کو جوڑنے والے واقعات اور حسین لمحات کی بازیافت سے کیوں اجتناب برتا گیا؟ اِس نفاست، نزاکت، عقیدت، محبت اور میل و مروت کو باقاعدہ احاطۂ تحریر میں لینے کے بجائے فوقیت لکھنؤ، الٰہ آباد اور بنارس کو ملی، باندہ اور حلقۂ باندہ کو نہیں۔ کیوں اِس اہم انسانی شرافت، اور مشرقی اقدار کے جذباتی رشتے سے چشم پوشی اختیار کی گئی، حیرت و استعجاب کا لمحہ ہے۔ غالبؔ کی زندگی میں اُن کے طویل ترین سفر کا یہ وہ پڑاؤ ہے جہاں موصوف باقاعدہ علاج کراتے ہیں، تازہ دم ہو کر رختِ سفر باندھتے ہیں۔ غور کیجیے باندہ میں نہ صرف بقیہ سفر کا پورا بندوبست ہوتا ہے بلکہ کلکتہ کے دورانِ قیام مطلوبہ چیزیں بھی مہیا کرائی جاتی ہیں اور پھر دہلی تک پہنچنے کا اہتمام بھی۔ اور ان سب کا مرکز و محور ہے دیوان محمد علی۔

اہمیت، افادیت اور معنویت کا جو خاکہ مرتب ہوتا ہے اُس میں جدید تحقیقی تناظر میں باندہ سے کلکتہ اور پھر واپسی پر دہلی تک بخیر و عافیت پہنچنے کی روداد مکتوباتِ غالبؔ بنام دیوان محمد علی سے مربوط ہو جاتی ہے۔ جس کا Credit سید اکبر علی ترمذی کی کتاب Persian Letters of Ghalib کو پہنچتا ہے۔ دریافت کو مزید استحکام بخشنے میں لطیف الزماں اور پرتو روہیلہ نے اپنے نام درج کرائے ہیں۔ ان قابلِ تعریف شخصیات کی گراں قدر خدمات کے تعلق سے جمیل جالبی نے ''کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالب'' میں لکھا ہے:

> ''ادب عالیہ کا وہ انمول خزانہ جو ڈیڑھ سو سال سے مقفل پڑا تھا، یکدم کُھل گیا ہے''۔

بلکہ اکیسویں صدی میں اس خصوصی نکتہ پر کام کرنے کے لیے در وا ہوتے ہیں۔

خاکسار نے سب سے پہلے غالبؔ کے باندہ تک پہنچنے کی مکمل تفصیل کو اِس کتاب میں شامل کر کے مکمل رودادِ سفر کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ دوئم یہ کہ وہ محترم شخصیت جو نواب باندہ اور غالبؔ دونوں کو عزیز تھی، اُن کی شخصیت اور نسل در نسل غالبؔ سے اُنسیت کی روداد رقم کی ہے اور

حقائق وشواہد سے یہ واضح کرنے کا جتن کیا ہے کہ دیوان محمد علی کے نام محض تین ساڑھے تین سال میں لکھے گئے تین درجن سے زائد خطوط نہ صرف تاریخی حیثیت کے ہیں بلکہ اُس دور کے شعری منظرنامے کے بھی رہینِ منت ہیں۔

دورِ حاضر کے محققین اور ناقدین نے Persian Letters of Ghalib کی اشاعت کا خیر مقدم کیا لیکن مذکورہ مسودہ کی حصولیابی کے پس منظر کو تہہ بہ تہہ کھنگالنے کا جتن نہیں کیا۔ مکتوب الیہ اور مکتوب نگار کے مابین عیاں ہونے والے قریبی ربط کے اعتراف کے باوجود یہ جاننے کی کوشش نہیں کی گئی کہ محمد علی صاحب کون تھے؟ اُن کا ادبی سرمایہ کہاں اور کس حال میں ہے؟ اُس ادب شناس مُحِب نے باندہ میں موجود غالبؔ کے عزیزوں سے بڑھ کر غالبؔ کی مدد کیوں کی؟ اور کیوں اپنے دوستوں اور عزیزوں سے بھی اس بابت متواتر درخواست کرتا رہا؟ گنجینۂ معنی کے طلسم کو تلاش کرنے میں مسیحا صفت شخص سے گُریز کیوں برتا گیا؟ اِس کا کوئی تشفی بخش جواب و جواز نہیں تھا جسے تلاش کرنا ضروری تھا۔

میں نے مذکورہ عنوان کے تحت اپنی اِس کتاب میں جو اسباب وعلل تلاش کیے ہیں وہ اِن دلائل پر مبنی ہیں کہ غالبؔ کی زندگی میں شائع ہونے والے خطوط میں اُن کی مرضی کے مطابق وہ آٹھ خط جو دیوان محمد علی کے نام تھے اور جن کے مطالعہ سے مکتوب الیہ اور قیامِ باندہ پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی تھی قارئین کے پیشِ نظر تھے۔ اِن میں باندہ اور وہاں کے عزیزوں کا ذکر اس وجہ سے بھی ضمنی ہوا کہ وہ ۱۸۵۷ء میں معتوب ہوئے، راہِ فرار اختیار کی۔ دوسرا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دیوان محمد علی کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں پر اس لیے توجہ کم دی گئی کہ ۱۸۳۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے بآسانی مواد فراہم نہیں تھا اور ''جوں توں، گرتے پڑتے'' ہمارے اکثر محققین اور ناقدین کام کے قائل نہیں البتہ دو چار سرپھرے نظر آ ہی جاتے ہیں جن کی کاوش کے نتیجہ میں ایسے مخطوطات اور مسودات منظرِ عام پر آئے جنھوں نے غور وفکر کے نئے در وا کیے ہیں۔ اور اب نئے سرے سے اِس جانب کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

غالبؔ کے سفرِ کلکتہ کے آغاز سے اِس وقت (دسمبر ۲۰۲۰ء) تک کے کینوس کو سامنے رکھیں تو اِس طویل وقفے کے شواہد کے دو حصّے ہو سکتے ہیں۔ پہلا ''پنج آہنگ'' سے ۱۹۶۹ء تک، دوسرا سید

اکبر علی ترمذی کی دریافت ''نامہ ہائے فارسی غالبؔ'' سے آج تک۔ حصہ اول کے تحت ایک صدی سے زائد عرصہ تک یہی بحث ہوتی رہی کہ وہ مصیبتوں کے دور میں، سمتِ مخالف علاج وامداد کے لیے اپنے عزیزوں کے پاس باندہ گئے۔ شواہد موجود ہیں کہ وہ ایک ڈیڑھ ماہ میں تقریباً ٹھیک ہو گئے اور جلد ہی مطلوبہ رقم بھی مل گئی تو پھر مزید تین چار ماہ وہاں قیام کیوں کیا؟ حصہ دوم باندہ میں ملے نئے دوست محمد علی پر مبنی ہے۔ ادب شناس اور علم نواز دیوان محمد علی علاج وامداد کا وسیلہ بنتے ہیں۔ قُربت جلد ہی دوستی میں تبدیل ہو جاتی ہے مگر بُزرگ اور خُورد کی یہ دوستی ضرورتاً یا مصلحتاً وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ ذہنی اور فکری ہم آہنگی نے جلد ہی بے تکلفانہ مراحل طے کر لیے تھے۔ محمد علی، غالبؔ کی انا اور خود پسندی کو ملحوظ رکھتے تھے اور غالبؔ اُن کی دانش ورانہ فکر اور فارسی پر عبور کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے نیز اُن کے بے لوث مشفقانہ مشوروں پر عمل کرتے تھے جن کے غماز ۳۷؍ دستیاب خطوط ہیں۔

غالبؔ کی عظمت، اُن کی دانشورانہ فکر وشعور اور فنّی گرفت کی رہینِ منت ہے جس میں تاثیر کے ساتھ جدّت اور نُدرت ہے۔ اندازِ جُداگانہ اُن کے فارسی اور اردو خطوط میں جلوہ گر ہے۔ ایسے ان گنت خطوط ہیں جن میں انھوں نے اپنے دل کی بات کہی ہے لیکن دیوان محمد علی کے نام لکھے گئے فارسی خطوط جو پچھلی چند دہائیوں میں ترمذی، لطیف الزماں اور پرؔتو روہیلہ کی بدولت اردو قاری تک بھی پہنچے ہیں، ان میں دلی کیفیات وجذبات کے ساتھ معاملہ فہمی اور اپنے مصائب ومسائل سے نکلنے کی حکمتِ عملی کے متعدد اشارے ہیں۔ تیس بتیس برس کی عمر میں غالبؔ کے نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر اُبھرنے والے یہ قیمتی اشارے آج ان گنت کہانیوں کے تانے بانے بُننے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ نیز اُن کے غیر معروف مگر اہم ممدوح الیہ کی مثالی شخصیت سے متعارف کرا رہے ہیں۔

پروفیسر صغیر افراہیم
سابق صدر شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
s.afraheim@yahoo.in

خطۂ بندیل کھنڈ کا مرکزی محور' باندہ'

برِصغیر کے دیگر علاقوں کی طرح ''بندیل کھنڈ'' کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے جس کے شواہد آثارِ قدیمہ پر کام کرنے والے دانشوروں کی تحقیقات میں ملتے ہیں۔ آریہ قبائل کی آمد اور پھر اُن کے تسلّط کے بعد یہاں کے تاریخی اور جغرافیائی منظر بدلتے رہے ہیں۔ یہ حصّہ کبھی ہندوستان کے وسطی علاقہ ''مدھیہ دیس'' میں شامل تھا۔ این. ایس. بوس (ہسٹری آف چندیلا ز ۱۹۵۶ء) اور سید محمد الیاس مغربی (تاریخ بندیل کھنڈ ۱۹۷۸ء) کے مطابق شمال میں دریائے جمنا، جنوب میں کوہ وندھیاچل کا سلسلہ تھا جو مغرب سے مشرق تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے دونوں کناروں پر دریائے چنبل اور نربدا واقع تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد یہ سرحدیں تبدیل ہوتی رہیں۔ عرصہ بعد خشک، چٹیل پہاڑیوں سے گِھرا ہوا علاقہ بندیل کھنڈ کے نام سے اُبھرتا ہے اور آگرہ کے پایہ تخت بننے کے بعد اِس دشوار گزار تپتے ہوئے علاقہ کی جانب توجہ مبذول ہوتی ہے۔ یہاں کے قدیم باشندے سناتن دھرمی تھے۔ اُن کے کثرت سے بنے مندروں میں شنکر بھگوان کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ رِگ وید کے حوالے سے یہ بھی مشہور ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں امرت منتھن کے بعد شنکر جی نے زہر پینے کے بعد قیام کیا تھا۔

تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے بندیل کھنڈ کا اہم حصّہ باندہ زمانۂ قدیم سے بندیلی سرداروں کی آماج گاہ تھا۔ بہادری، وفاداری اور جانفشانی کے چرچے تھے۔ مذہبی رواداری کی بنا پر دُور دراز سے لوگ امن وامان، سکون وشانتی اور گیان دھیان کے لیے قصدِ سفر کرتے جس کی بنا پر بالواسطہ طور پر یہاں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ان کے نشانات آج بھی پنچ مُکھی شیو مندر،

قلعہ کالنجر اور قرب و جوار کی گھاٹیوں میں موجود ہیں۔ محققین نے اس کے شواہد محمود غزنوی، قطب الدین ایبک، تغلق عہد اور مغلوں کے زمانے میں تلاش کیے ہیں۔ تبدیلیٔ وقت کا جو دوسرا منظر نامہ اُبھرتا ہے وہ مغلوں کے کمزور پڑتے ہی بندیلوں پر مرہٹوں کے دبدبے کے قائم ہونے کا ہے۔ اس کینوس میں باندہ، جھانسی اور جالون کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اُبھرتی ہیں۔

وسطی ہندوستان سے وجود میں آنے والا بندیلی علاقہ چوں کہ بے حد دشوار گزار راہوں سے بھرا ہوا تھا، اس لیے شمالی ہندوستان کے حکمرانوں نے سنجیدگی سے اس جانب توجہ نہیں دی۔ سکندر لودی نے جب آگرہ کو عارضی طور پر اپنے دارالسلطنت کے لیے منتخب کیا تو بندیل کھنڈ سے قربت بڑھی۔ مغلیہ سلطنت کے قیام کے بعد اِس علاقے سے رابطے وسیع ہوئے۔ تہذیب وثقافت اور زبان وادب کی جانب بھی توجہ دی جانے لگی اور یہ چٹیل علاقہ بھی گنگا جمنی تہذیب سے سیراب ہونے لگا۔

مشہور صوفی اور اردو کے ادیب شیو برت لال ورمن اور نامور محقق پروفیسر محمد انصار اللہ نے اس کے شواہد پیش کیے ہیں کہ بندیل کھنڈ کے راجہ چھتر سال کے عہد (۱۶۷۴ء-۱۷۳۹ء) میں معروف صوفی مہامنی سوامی پران ناتھ یہاں تشریف لائے تھے جن کی خدمات سے متاثر ہو کر راجہ چھتر سال اُن کے مرید ہو گئے تھے۔ مہامنی پران ناتھ سنسکرت کے علاوہ عربی اور فارسی کی اچھی سوجھ بوجھ اور صوفیانہ شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ پرانامی (دھامی) مسلک کے تحت عوام کو یکجہتی اور مساوات کی تعلیم دیتے اور اپنے نقطۂ نظر کی بندیلی میں بھی تلقین کرتے۔ شیو برت لال ورمن اور انصار اللہ نے مذکورہ پس منظر میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پرانامی نظریات کی ترویج واشاعت کی بدولت بندیلی زبان پر عربی، فارسی اور اردو الفاظ کے اثرات قائم ہوئے بلکہ وہ رفتہ رفتہ عوامی زبان کی شکل اختیار کرتے گئے جو اردو زبان وادب کی فضا کو ہموار کرنے میں معاون ہوئے۔

قدیم وجدید بندیل کھنڈ اور اُن کے معروف اضلاع کی بحث سے قطع نظر محض ضلع باندہ کو جغرافیائی اعتبار سے دیکھیں تو خشک، چٹیل پہاڑیوں سے گِھرا ہوا یہ خطۂ اپنے محدود وسائل کی بنا پر پسماندہ رہا ہے۔[۲] تاریخی اعتبار سے[۳] بھی یہ علاقہ دُھندلکے میں رہا ہے۔ اِس کے شمال میں دریائے جمنا، جنوب میں وِندھیاچل کی پہاڑیاں، مشرق میں فتح پور اور ہمیر پور، مغرب میں کالنجر

اور موجودہ مدھیہ پردیش کا علاقہ ہے۔ دھنش کی شکل میں دِکھنے والا کا دمگری پہاڑ جسے چتر کوٹ گری بھی کہتے ہیں، جغرافیائی اعتبار سے بھی بے حد اہم ہے۔ قریب ہی دریائے کین کے علاوہ بیتوا، باگھیں، پیسونی، پانچ، دھسان نامی چھوٹی چھوٹی معاون ندیاں ہیں جو مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی دریائے جمنا میں مِل جاتی ہیں۔ شہر باندہ سے تقریباً تیس کوس کے فاصلہ پر معروف زیارت گاہ چتر کوٹ ہے۔ پہاڑوں کے بیچ سے شروع ہونے والے راستہ یعنی راجہ پور (ضلع باندہ) میں بیٹھ کر تُلسی داس نے رامائن لکھی۔ ''رامائن'' کے علاوہ ''کویتاولی''، ''دوہاولی'' اور ''وِنئے پتریکا'' میں بھی اِس کا بیان ہے۔ کالیداس نے اِس ''رام گیری'' کا بیان ''رگھوونش'' اور ''میگھ دوت'' میں خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ چتر کوٹ کا ذکر بالمیکی کی رام چرتر مانس میں بھی ہے۔ کالنجر کے تاریخی قلعہ اور اُس کے قرب و جوار کا تفصیلی ذکر مشہور مؤرخ اور سیاح ابوالریحان البیرونی نے بھی کیا ہے۔ ماضی بعید میں یہ پورا علاقہ چندیلیوں کے پاس رہا پھر پیشوا باجی راؤ (۱۶۹۹ء-۱۷۴۰ء) کی اولوالعزمی کی بدولت مذکورہ علاقہ بندیلہ راجہ چھتر سال کی حکمرانی میں آ گیا۔

راجہ چھتر سال نے اپنے انتقال (۱۷۳۹ء) سے قبل بندیل کھنڈ کو تین حصّوں میں منقسم کر دیا تھا۔ دو حصے اپنے دونوں بیٹوں اور تیسرا حصّہ منھ بولے بیٹے مرہٹہ سردار باجی راؤ پیشوا کو دے دیا تھا۔ راجہ چھتر سال اور پھر اگلے سال باجی راؤ پیشوا کی آنکھ بند ہوتے ہی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ مرہٹہ فوج پانی پت کی جنگ کے بعد ملکی انتظام اور منتشر ماحول کو بہتر بنانے کی تگ و دو میں تھی۔ ایسے میں مذکورہ خانہ جنگی کو ختم کرنے کے لیے پیشوا سرکار نے علی بہادر اوّل کو فوج کشی کا حکم دیا جس نے اپنی حکمت عملی اور بہادری سے پورے علاقہ کو فتح کر کے مرہٹہ حکومت میں شامل کر دیا۔ پیشوا نے خوش ہو کر انھیں باندہ کا علاقہ اور نواب کا خطاب عطا کیا۔

پیشوا باجی راؤ نے بزرگوں کے کہنے پر رانی کاشی بائی، رانی رادھا بائی سے اور اپنی مرضی سے مستانی بیگم سے شادی کی تھی۔ مستانی بیگم کے والد راجپوت (مہاراجہ چھتر سال) اور والدہ مسلمان تھیں۔ فنون سپہ گری کے ہُنر سے واقف مستانی بیگم رقاصہ اور مغنیہ بھی تھیں۔ تصوّف سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ اُن کے بیٹے شمشیر بہادر (اوّل) نے اپنی سلطنت کی قلمرو بھرت پور تک وسیع

کر لی تھی۔ شمشیر بہادر اول کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے علی بہادر اوّل نے ۱۷۹۰ء میں باندہ کو فتح کیا تھا، اُن کی کوششوں سے نوابی دور کا قیام عمل میں آیا۔ علی بہادر اوّل نے دو شادیاں کیں۔ پہلی پیشوا خاندان میں۔ دوسری آگرہ کے ایرانی النسل مسلم خاندان میں۔ یہ بیگم، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی مومانی کی سگی بہن تھیں، اور ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ اُن کے تین بیٹے نواب شمشیر بہادر (دوم)، نواب ذوالفقار علی بہادر اور جگت بہادر تھے۔ ۱۸۰۲ء میں اچانک علی بہادر اوّل کا انتقال ہوگیا لہٰذا اُن کی پونا کی پہلی بیوی سے پیدا بیٹے شمشیر بہادر دوئم گدی نشین ہوئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مرہٹے انگریزوں سے مصالحت کر لیتے ہیں اور جنگی تاوان کے طور پر بندیل کھنڈ کا علاقہ اُن کے سپرد کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً ۱۸۰۴ء میں شمشیر بہادر ایک آزاد نواب نہ رہ کر انگریزوں کے پینشن یافتہ نواب ہو جاتے ہیں۔ اپنے اس کرب کو چھپانے کے لیے وہ ادب و ثقافت اور تعمیرات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ نیز اپنے سوتیلے بھائی ذوالفقار علی کی، جو بچپن سے بے حد ذہین اور اُن کے چہیتے تھے، تعلیم و تربیت کے لیے دُور دراز کے اہلِ کمال کو باندہ بلواتے ہیں۔ ۱۸۲۳ء میں شمشیر بہادر دوئم کے انتقال کے بعد ذوالفقار علی نواب ہوتے ہیں اور ۱۸۴۹ء تک باندہ پر حکمرانی کرتے ہیں۔ نواب صاحب کو شعر و ادب کے ساتھ ساتھ موسیقی کا بھی شوق تھا[۵]۔ ان کے عہد میں تہذیبی، سماجی اور ثقافتی اداروں کو فروغ حاصل ہوا۔ رانی لکشمی بائی کے ہاتھ پر راکھی باندھ کے وہ اُن کے بھائی بن گئے تھے، اِس رشتہ کو اُن کے بیٹے علی بہادر ثانی علؔی نے بھی خوبی سے نبھایا۔ نواب ذوالفقار علی کے دورِ حکومت میں غالبؔ باندہ تشریف لائے تھے۔ اُن کا زمانہ امن و امان کا رہا۔ ملک میں پھیلی ہوئی ابتری میں قدرے سکون کی بنا پر اہلِ علم یہاں آتے رہتے۔ نواب ذوالفقار علی کی بدولت اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی جانب بھرپور توجہ دی گئی۔ سعادت یار خاں رنگینؔ[۶]، نادرؔ بریلوی[۷]، منیرؔ شکوہ آبادی[۸] کچھ عرصے کے لیے یہاں تشریف لائے۔ لیکن غالبؔ کے عارضی قیام نے باندہ کے ادبی ماحول کو تقویت بخشی، اعتبار عطا کیا۔

○○○

حواشی

۱؎ جان برنٹن (John Brunton) اور اُن کے بھائی ولیم برنٹن (William Brunton) کے علاوہ جنرل کننگھم (Gen. Cunningham) اور ایچ.جی. ویلز (H.G. Wells) نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ آر.ڈی. بنرجی، دیارام ساہنی، ڈاکٹر رام سرن شرما نے اس کے تاریخی شواہد تلاش کیے ہیں۔ ڈاکٹر دیال شنکر شاستری اور ڈاکٹر ایشوردت شیل نے سنسکرت ساہتیہ کے اتہاس میں اِس خطۂ ارض کا معروضی مطالعہ کیا ہے۔

۲؎ ماقبل تاریخ باندہ اور اس کے آس پاس کے علاقے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں ندیوں، پہاڑیوں اور گھنے جنگلوں کی بنا پر انسانی آبادی برائے نام تھی۔ صرف اس ملک کے قدیم باشندے کول، گونڈ، بھیل ان جنگلوں میں خال خال بستے تھے۔ یہاں عموماً سادھوسنتوں کا گزر ہوتا تھا۔ تہذیب یافتہ زمانے میں دوسرے علاقوں میں لڑی گئی جنگوں میں شکست خوردہ سورما راہ فرار اختیار کر کے اس علاقے میں اپنی باقی زندگی گم نامی میں گزارنے کی خاطر آ بستے تھے کیوں کہ وطن واپسی ان کے لیے باعث ننگ ہوا کرتی تھی۔ چودھویں صدی عیسوی سے یہاں کے حالات بہتر ہونے شروع ہوئے۔

۳؎ آثار قدیمہ، لسانیات اور جغرافیہ کے محققین کے مطابق آریہ قبائل نے اپنے زیر تسلط علاقوں میں جو سولہ جن پد قائم کیے تھے، وہ کرو، پنچال، شورسینی، وتس، کوشل، سل، آ نگ، کاشی، مگدھ، وجّی، چیدی، متس، اسمک، اونتی، گاندھار، کمبوج ہیں۔ ان میں گیارھویں ریاست 'چیدی' کا علاقہ باندہ کے قرب وجوار میں دریائے کین کے کنارے تھا۔ اس کا کچھ حصہ اشوک اعظم کی مملکت میں بھی شامل تھا۔ رفتہ رفتہ جنگ وجدال سے گزرتا ہوا باندہ اور اُس کے آس پاس کا علاقہ چندیلیوں کے پاس آ گیا۔

۴ے بابو دیبی پرشاد (جغرافیہ ضلع باندہ)، پنڈت کشن نرائن (تاریخ بندیل کھنڈ و جالون)، پنڈت شیام لال (تاریخ بندیل کھنڈ)، سید محمد الیاس مغربی (تاریخ بندیل کھنڈ) اور انصاراللہ (تاریخ زبان و ادب) نے اس کا ذکر کیا ہے کہ علی بہادر اول نے غلام قادر روہیلہ کو گرفتار کر کے سندھیا کے ذریعہ سرکار دہلی میں پیش کرایا تھا، خوش ہو کر بادشاہِ دہلی نے انھیں مراتب سے سرفراز کرنے کے ساتھ ان کے خاندان کی چار نعشوں کو شاہی قبرستان میں دفن کیے جانے کی اجازت عطا کی تھی۔ لہٰذا نواب علی بہادر اول، نواب شمشیر بہادر ثانی اور نواب ذوالفقار علی بہادر کی تدفین دہلی کے شاہی قبرستان میں ہوئی۔

۵ے ۱۸۳۴ء میں ہندوستانی موسیقی سے متعلق این آگسٹس وِلارڈ (N. Augustus Willard) نے A Treatise on the Music of Hindoostan کے عنوان سے کتاب لکھی جو کلکتہ کے بپٹسٹ پریس (Baptist Press) سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب موجودہ گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنگ کی بیگم صاحبہ کے نام معنون تھی۔ اِس معروف کتاب میں سو سے زائد صفحات کلاسیکی موسیقی سے متعلق ہیں۔ اسی حصہ میں نواب ذوالفقار علی کو موسیقی سے دلچسپی کا تفصیلی ذکر ہے۔

۶ے باندہ میں رنگینؔ کا قیام دسمبر ۱۸۲۷ء سے وسط ۱۸۳۳ء تک رہا۔ حالاں کہ وہ اپنے مزاج اور سوداگری کے سبب کہیں مستقل قیام نہیں کر پاتے تھے۔ مگر نواب کی قربت اور اُن کے مصاحبِ خاص شمشیر خاں کی وجہ سے باندہ میں رہے۔ صالحہ بیگم قریشی نے اپنے تحقیقی مقالہ میں اُن کے اشعار درج کیے ہیں ؎

میں اک جا دل لگاتا نہیں
مجھے رہنا اک جا کا بھاتا نہیں
چلا اب ہاتھ سے ہے مرا بس گیا
کہ باندہ میں ہوں آکر پھنس گیا

برس دو سے اس جا پہ پابند ہوں
میں پابند ہوں ایک خود سند ہوں

۷ے مرزا عباس بیگ نادرؔ بریلوی، نواب ذوالفقار علی کے آخری عہد میں باندہ تشریف لائے تھے۔نواب علی بہادر ثانیؔ کے زمانہ میں اُن کا قتل ہوگیا تھا۔منیرؔ شکوہ آبادی نے اُن کے قتل پر ایک تاریخی قطعہ لکھا تھا جو موصوف کے کلیات میں صفحہ نمبر ۴۸۷ پر درج ہے۔

۸ے منیرؔ شکوہ آبادی باندہ کئی بار تشریف لائے۔پہلی بار جب نواب ذوالفقار علی کے بیٹے علی بہادر نے قرآن حفظ کیا تو جشن میں شرکت کی غرض سے، دوسری بار نواب صاحب کے انتقال اور علی بہادر ثانی کی مسند نشینی کے موقع پر اور تیسری بار ۱۸۵۰ء میں آئے اور یہاں چھ سال رہ کر انھوں نے اپنا دیوان ''منتخب العالم'' مرتب کیا۔

نواب ٹینک (تالاب) جو غالبؔ کے سامنے پختہ ہو رہا تھا۔

غالبؔ کے سفرِ کلکتہ کے اسباب و علل

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

غالبؔ آگرہ[1]، فیروز پور جھرکہ، رام پور[2] کے سفر کرتے ہی رہے لیکن سفرِ کلکتہ کئی اعتبار سے یادگار بن گیا ہے۔ یہ سفر سیاحت کے شوق میں نہیں مجبوراً اختیار کیا گیا جس کے مثبت نتائج کا انھیں عمر کے آخر تک انتظار رہا۔[3] تاریخ شاہد ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی غالبؔ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ پنشن کی بحالی کا تھا۔ یہ مسئلہ لوہارو کے نواب احمد بخش کا پیدا کردہ تھا جنھوں نے خاندان کے ایک غیر شخص مرزا حاجی[4] کو پنشن کا حقدار بنوا کر غالبؔ اور اُن کے بھائی کے ساتھ حق تلفی کی تھی۔ غالبؔ اسی حق تلفی کے خلاف مسلسل یاد دہانی کراتے رہے۔

منصوبہ بند سفر تو غالبؔ کے بزرگوں[5] نے بھی نہیں کیا تھا۔ وہ تلوار کے دھنی اور یہ قلم کے سپاہی تھے۔

سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اِسی لیے مُسافرت کے اِس تخلیق کار کا جہاں جہاں سے گزر ہوا وہاں کے حسن، عظمت، تاریخی، جغرافیائی، سماجی، عمرانی پہلوؤں کو اپنی مثنویوں، رباعیوں، غزلوں بلکہ خطوط میں بھی سمیٹتے ہوئے انھیں فنکارانہ ڈھنگ سے تحلیل کر دیا ہے۔ غالبؔ کی نگارشات مختلف معاشروں میں متصادم تہذیبی اور ثقافتی عناصر سے کچھ اس طرح واقف کراتی ہیں جیسے ان میں ہندوستانی دلوں کی دھڑکنیں قید ہو گئی ہوں۔

غالبؔ نے انتیس تیس سال کی عمر[6] میں زندگی کا یہ طویل سفر اختیار کیا۔ کیوں کیا؟ یہ الم نشرح ہے۔ غالبؔ جب پانچ سال کے تھے تو اُن کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا کوالور (راج گڑھ) میں ایک مہم جوئی کے دوران گولی لگنے سے انتقال ہوگیا تھا۔ چچا نصر اللہ بیگ جو لاولد تھے، بھائی کے بچوں کی پرورش کا پورا خیال رکھتے تھے۔ تقریباً چار سال بعد چچا مرزا نصر اللہ بیگ جو برطانوی فوج میں ملازم تھے، ایک حادثہ میں زخمی ہوئے اور چند دنوں بعد فوت ہوگئے۔ (پنج آہنگ میں شامل ایک خط جو غالبؔ نے سراج الدین احمد کو لکھا اُس میں درج ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے کم وبیش پانچ سال بعد چل بسے) نواب احمد بخش خاں والی لوہارو جن کے سپرد ورثا کی نگہہ داشت تھی اور جو رشتہ میں نصر اللہ بیگ کے خُسر تھے۔ (کچھ کتابوں میں درج ہے کہ نواب احمد بخش کی ہمشیرہ نصر اللہ بیگ کو منسوب تھیں) انھوں نے مرحومین کے وارثوں کے لیے نہایت ہوشیاری سے مالی امداد کے احکام جاری کرالیے۔ لارڈ لیک نے مئی ۱۸۰۶ء میں اُن کے پس ماندگان کو دس ہزار روپیہ کا وظیفہ منظور کیا، اس میں مرحوم نصر اللہ بیگ کے گھر کی خواتین، غالبؔ اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف خاں حصہ دار تھے۔ لیکن ۷رجون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش نے اپنے مفادات کے پیش نظر لارڈ لیک سے ایک اور خط حاصل کیا جس کے مطابق وظیفے کی رقم آدھی یعنی پانچ ہزار رہ گئی اور اس میں بھی احمد بخش نے اپنے اثر ورسوخ سے خواجہ حاجی کے نام دو ہزار روپے، نصر اللہ بیگ کی والدہ اور بہنوں کو پندرہ سو نیز غالبؔ اور ان کے بھائی کو بھی پندرہ سو روپے پنشن میں شامل کروادیئے۔

غالبؔ کے دعویٰ کے مطابق مذکورہ خط جعلی تیار کروایا گیا تھا۔ اس کی رو سے دوسرے لوگوں کی پنشن میں اضافہ اور غالبؔ کی پنشن کم ہوگئی تھی۔ معاملہ کے وقت غالبؔ نو سال کے تھے۔ چار سال بعد نواب احمد بخش خاں والی لوہارو فیروز پور جھرکہ کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی بیٹی امراؤ بیگم[7] سے غالبؔ کی شادی ہوئی۔ لگتا تھا کہ اب فیروز پور، جھرکہ اور لوہارو کے نواب احمد بخش نے خاندان سے الگ جو خواجہ حاجی کا نام پنشن میں شامل کرادیا تھا، وہ اب خارج کروادیا جائے گا مگر ایسا ہو نہ سکا بلکہ خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد پنشن اُن کے بچوں کو منتقل ہوگئی۔ غالبؔ اس غیر منصفانہ عمل کے خلاف مجبور اُعدالت گئے۔

دلّی جو ایک شہر نہیں، ایک دبستان تھا، اُس کی یادوں کے جھروکوں سے نکلتے ہوئے غالبؔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بسائے ہوئے جدید شہر کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ حالؔی سے لے کر انصار اللہ تک سبھی نے اس کا ذکر کیا ہے کہ غالبؔ نے فیروز پور جھرکہ میں مایوس ہو کر کلکتہ جانے کا ارادہ کیا۔ البتہ کچھ محققین کا کہنا ہے کہ قرض خواہوں کے ڈر سے دلّی نہ جا کر فیروز پور جھرکہ ہی سے کلکتہ کے سفر کا آغاز کیا۔ کچھ لوگ اس پر متفق ہیں کہ فرخ آباد کے راستے کانپور پہنچے اور وہاں بیمار ہو گئے، لیکن سب کا اس پر اتفاق ہے کہ لکھنؤ کی فضا، ماحول اور صورتِ حال راس نہ آنے کی وجہ سے باندہ گئے۔ اس طرح جھرکہ، بھرت پور، فرخ آباد، کانپور، لکھنؤ، باندہ، الٰہ آباد، بنارس، عظیم آباد اور مرشد آباد ہوتے ہوئے غالبؔ کلکتہ پہنچے۔ یہ طویل سفر انھوں نے تین سال سے زائد کے عرصہ میں طے کیا۔[۸] جدید سہولیات سے آراستہ ٹکنالوجی کے اِس دور میں نئی نسل کے پیش نظر یہ ڈھائی تین ہزار کلومیٹر کا فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے لیکن تقریباً تین سو سال قبل جب فضا میں سند بادی، حاتم طائی یا طلسماتی سفر کی گونج برقرار تھی، غالبؔ جیسے کج کُلاہ شاعر کے لیے سفرِ کلکتہ طویل بلکہ بہت طویل تھا، اِس کے مثبت اور دیرپا اثرات کے تعلق سے شیخ محمد اکرام ''غالبؔ نامہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''---بادی النظر میں مرزا کا سفرِ کلکتہ بیکار ثابت ہوا، اور حصولِ جائداد کی تمام تگ و دو رائیگاں گئی لیکن مرزا کے مشاہدے کی وسعت اور ذہنی نشو و نما کے لیے کلکتے کا سفر بہت مفید رہا۔ ایک تو غربت میں طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھا کر جو قسم قسم کے آدمیوں کا تجربہ ہوتا ہے وہ ہوا--- انھوں نے سفر کلکتہ کے بعد عرصے تک اُردو اشعار بہت کم لکھے ہیں لیکن اس کے پہلے اور بعد کے فارسی اشعار میں جو فرق ہے وہ طبیعت اور دماغ کی اُس پختگی کو نمایاں کرتا ہے جو اس تین سال کے عرصے میں اُنھیں حاصل ہوئی''۔ (ص:۸۱-۸۲)

○○○

حواشی

۱؎ ۱۳-۱۸۱۲ء میں جب غالبؔ آگرہ سے دہلی آ کر مکمل سکونت اختیار کرتے ہیں تو دہلی کا بادشاہ اکبر شاہ ثانی اور کمپنی کا ریزیڈنٹ آکٹرلونی (Ochterloney) تھا۔

۲؎ پہلی بار ۱۹/جنوری ۱۸۶۰ء کو اور دوسری مرتبہ ۷/اکتوبر ۱۸۶۵ء کو گئے

۳؎ اپنوں کی ہٹ دھرمی، فریب اور حاکمِ وقت کی چشم پوشی نیز مصلحت اندیشی کی وجہ سے مقدمہ بار بار خارج ہوتا رہا مگر غالبؔ کے ذہن سے پنشن کے حصول کا تصور ختم نہیں ہوسکا۔ ۱۸۳۱ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے غالبؔ کے خلاف فیصلہ دیا۔ انھوں نے اپنی عرضداشت لندن، کورٹ آف ڈائریکٹرز میں بھیجی، ملکۂ وکٹوریہ سے اپیل کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی وہ مسلسل مراسلت کرتے ہوئے حق وانصاف کی دہائی دیتے رہے۔ بہر حال ۴/مئی ۱۸۶۰ء میں کسی طرح سے سرکاری پنشن بحال ہوئی۔

۴؎ مرزا حاجی (خواجہ حاجی) کی حیثیت غالبؔ کے خاندان میں ملازم ومددگار کی تھی لیکن ان کی شادی مرزا جیون بیگ کی بیٹی، مرزا اکبر بیگ اور مرزا افضل بیگ کی بہن امیر النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ اس وجہ سے اُن کی حیثیت، رتبہ اور مرتبہ آہستہ آہستہ بدلتا گیا۔

۵؎ غالبؔ کے دادا مرزا فوقان بیگ اپنے کچھ ساتھیوں جن میں مرزا جیون بیگ بھی شامل تھے، اٹھارہویں صدی کے وسط میں سمرقند (بدخشاں) سے ہندوستان آئے۔ لاہور میں نواب معین الملک (۱۷۴۸ء-۱۷۵۳ء) کے یہاں ملازم ہوئے۔ نواب کے اچانک انتقال کے بعد قرب وجوار میں معاش کے سلسلہ میں تگ ودو کرتے رہے۔ کچھ عرصہ دہلی میں شاہ عالم ثانی کے شاہی ملازم ہوئے۔ مستعفی ہونے کے بعد اودھ، نظام حیدرآباد اور راجپوتانہ میں حاضر ہوئے اور الور کے راجہ بختاور سنگھ کی فوج میں مستقل ملازمت اختیار کرلی۔ البتہ رہائش آگرہ (اکبرآباد) میں اختیار کی۔ یہیں خواجہ غلام حسین کی بیٹی عزت النساء سے اُن کی شادی ہوئی۔

۶ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ عُرف مرزا نوشہ ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء مطابق ۸ر رجب ۱۲۱۲ھ کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ر ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کو اِس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ دو دن بعد دہلی کے ''اکمل الاخبار'' میں یہ خبر شائع ہوئی:

''جنابِ مرحوم دو تین مہینے صاحب فراش رہے۔ ضعف و نقاہت سے صدمے سہے، آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک فرمایا، اس دنیائے فانی سے بالکل دل اُٹھایا۔ تا آنکہ ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء دوشنبہ کو دو پہر ڈھلے اس خورشید اوجِ فضل و کمال کو زوال ہوا''۔

۷ نواب امین الدین احمد خاں والیٔ لوہارو کی چچازاد بہن، امراؤ بیگم سے ۹ر اگست ۱۸۱۰ء کو شادی ہوئی۔ سات بچے ہوئے مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔ بیشتر کا شیر خواری میں انتقال ہو گیا۔ لہٰذا امراؤ بیگم نے اپنے حقیقی بھانجے زین العابدین خاں عارفؔ کو گود لے لیا۔ بلکہ اُن کے بھی دونوں بچوں باقر علی اور حسین علی کی پرورش غالبؔ اور بیگم غالبؔ نے کی۔ محترمہ کا ۴ر فروری ۱۸۷۰ء میں انتقال ہوا۔

۸ قصدِ سفر کی بنیادی وجہ خاندانی پنشن میں غیر کی شمولیت کو ختم کرانا تھا۔ شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب ''غالبؔ نامہ'' میں غمِ روزگار کے عنوان سے پنشن کا قضیہ اِس طرح بیان کیا ہے:

''غالبؔ کا فارسی رسالہ اخیر ۱۸۲۵ء میں لکھا گیا اگر چہ اس سے غالبؔ کی جائداد کے جھگڑوں پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ لیکن غالباً ان کی ابتداء اسی زمانے میں ہو گئی تھی۔ نواب احمد بخش رئیس فیروز پور جھرکہ ولوہارو کے تین صاحبزادے تھے۔ نواب امین الدین، نواب ضیاء الدین نیّر درخشاںؔ اور ان دونوں کے سوتیلے بھائی اور مشہور شاعر داغؔ کے والد نواب شمس الدین۔ نواب احمد بخش نے ۱۸۲۲ء میں سرکار انگریزی اور مہاراجہ الور کی اجازت سے نواب شمس الدین کو تمام جائداد کا وارث قرار دیا تھا۔ لیکن اس فیصلے سے دوسرے بھائی خوش نہ تھے۔ اس لیے اس میں بعد کو ترمیم ہوئی۔ اور فروری ۱۸۲۵ء میں اپنے والد کے ایما پر نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارو چند شرطوں

کے ماتحت اپنے دو بھائیوں کے نام منتقل کر دیا۔ اور بالآخر اکتوبر ۱۸۲۶ء میں باقی جائداد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔
چوں کہ مرزا کی جاگیر بھی نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہوگئی تھی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ مرزا کو بھی اپنی حق تلفی کا خیال اسی زمانے میں ہوا ہوگا جب نواب احمد بخش نے اپنی جاگیر کے متعلق آخری فیصلہ کیا۔ مرزا کو جاگیر اپنے چچا نصر اللہ خاں بہادر کے وارث ہونے کی وجہ سے ملی تھی جن کی وفات پر ان کی جاگیر نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہوگئی تھی۔ اور نواب نے اس کے عوض ان کے ورثا کی نگہہ داشت کا ذمہ لیا تھا۔ مرزا نصر اللہ خاں کی اولاد کوئی نہ تھی۔ اور ان کے وارث مرزا غالبؔ، مرزا یوسف، مرحوم کی ماں اور بہنیں تھیں۔ مرزا غالبؔ کا دعویٰ تھا کہ مرزا نصر اللہ کے شرکائے حقیقی کے لیے دس ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر ہوئی تھی۔ لیکن نواب فقط تین ہزار دیتے تھے۔ جن میں مرزا کا حصہ صرف ساڑھے سات سو روپے تھا۔ شروع شروع میں تو نواب سے اُن کے اچھے تعلقات تھے اور نواب اُن کی مدد اور خبر گیری کرتے رہے، لیکن ۱۸۲۶ء کے قریب اختلافات رونما ہوئے۔ مرزا کے خسر مرزا الٰہی بخش معروفؔ جو نواب کے بھائی تھے۔ اس سال وفات پا گئے اور ممکن ہے ان کی وفات کے بعد نواب سے مرزا کے تعلقات کمزور ہو گئے ہوں --- غالبؔ کی حساس طبیعت کے لیے ذریعۂ معاش کی تنگی، بھائی کی بیماری، قرض خواہوں کے تقاضے اور دوسری مصیبتیں نا قابل برداشت تھیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ نواب کی خدمت میں اپنا دُکھ درد بیان کرو۔ بہت ممکن ہے کہ وہ امداد کرے۔ چنانچہ مرزا دہلی سے فیروز پور جھرکہ گئے۔ نواب ان دنوں الور میں تھا۔ اور اپنی پریشانیوں میں گرفتار تھا۔ اس لیے مرزا کو فیروز پور جھرکہ رُکنا پڑا''۔ (ص: ۶۵-۶۷)

غالبؔ اپنے مزاج کے مطابق پہلے تو فیروز پور جھرکہ میں رہ کر معاملہ کو خاندان میں ہی حل کرانے کی امکانی کوشش کرتے رہے لیکن اپنوں کے متعصّبانہ برتاؤ سے مایوس ہوکر انگریز دربار میں درخواست گُزار ہونے کے لیے باقاعدہ اپریل

۱۸۲۷ء میں دارالحکومت کلکتہ کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ ۲۰رفروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچتے ہیں۔۲۲رفروری کو دیوان محمد علی (صدرامین باندہ) کے سفارشی خط کے ساتھ ہگلی کے نواب سید اکبر علی خاں طباطبائی کے گھر پہنچتے ہیں۔ ۲۸راپریل کو انھوں نے گورنر جنرل کے نام ایک مفصل عرضداشت پیش کی۔ جون میں مدرسہ عالیہ کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ مختلف انگریز افسران سے ملنے کی جدوجہد کی۔ اُن کی مدح میں اشعار کہے۔ تھک ہار کر نومبر ۱۸۲۹ء میں دہلی واپس آ گئے۔

○○○

نواب علی بہادر اوّل
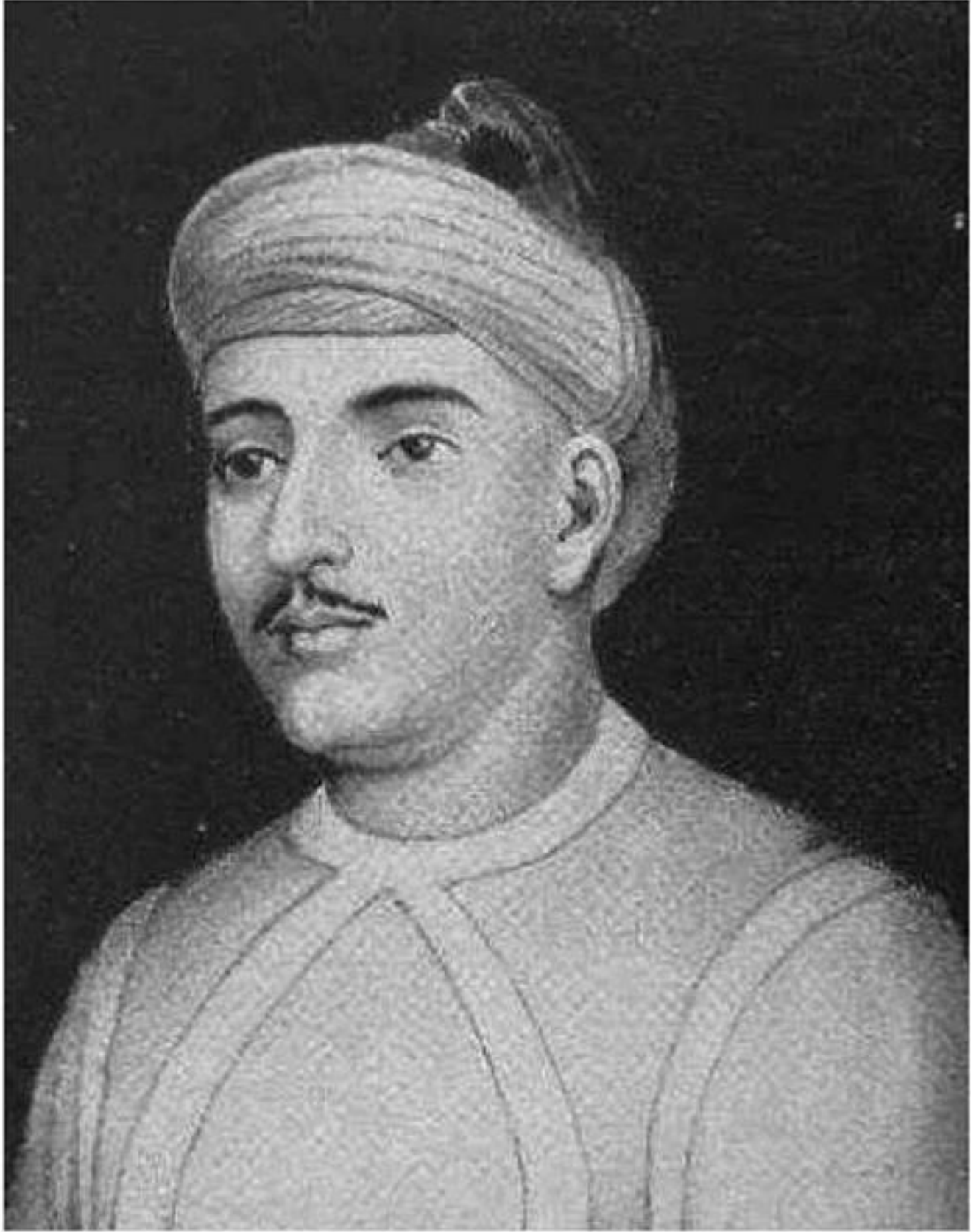
پیدائش ۱۷۵۸ء۔ وفات ۱۸۰۲ء

دورِ نوابی ۱۷۹۰ء سے ۱۸۰۲ء (۱۲ برس)

غالبؔ: آمدِ باندہ اور انتخابِ راہ

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی اپنے مضمون ''غالبؔ کا ایک مشہور تاریخی سفر'' میں لکھتے ہیں:

''لکھنؤ میں جب عرصہ تک قیام کرنے کے باوجود شاہی امداد ملنے سے مایوسی ہوگئی تو ۲۶/ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۲۱/جون ۱۸۲۷ء کو لکھنؤ سے کانپور کے لیے روانہ ہوئے---اور چار دن بعد کانپور پہنچے''۔ (ماہنامہ نقوش لاہور، شمارہ:۱۱، ۱۹۶۹ء، ص:۴-۸)

اسماعیل پانی پتی نے یہ بات الطاف حسین حالؔی کی مشہور کتاب ''یادگارِ غالبؔ'' سے لی ہے جس میں حالؔی نے اس کو تفصیل سے درج کیا ہے۔ کم وبیش دیگر محققین نے بھی یہی رائے اخذ کی ہے۔ عصرِ حاضر میں پروفیسر خلیق انجم ''غالبؔ کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ'' میں رقم طراز ہیں:

''غالبؔ ۲۶/ذیقعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۲۱/جون ۱۸۲۷ء بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ چوتھے دن کانپور پہنچے۔ کچھ دن آرام کرکے وہ کلکتے کے ارادے سے باندہ روانہ ہوگئے۔ غالبؔ نے کلکتے جانے کا ارادہ لکھنؤ میں اُس وقت کرلیا تھا جب وہ چارلس مٹکاف سے ملاقات میں ناکام ہوگئے تھے''۔ (ص:۴۰)

اِس سفر کے تعلق سے خلیق انجم صاحب نے جو مزید باتیں لکھیں وہ یہ ہیں---

۱- غالبؔ جون ۱۸۲۷ء کے اواخر یا جولائی کے شروع میں باندے پہنچ گئے۔ (ص:۴۲)

۲- جب غالبؔ باندے پہنچے ہیں تو اُن کی طبیعت بہت خراب تھی۔ (ص:۴۲)

۳- نواب ذوالفقار علی کے مہمان خانے میں غالبؔ نے چھ مہینے قیام کیا۔(ص:۴۳)

۴- باندے سے کلکتے کے لیے خاصی بڑی رقم کی ضرورت تھی اور غالبؔ کے پاس کچھ نہیں تھا۔(ص:۴۳)

۵- باندہ میں چھ مہینے گزار کر، صحت یاب ہو کر اور نواب ذوالفقار علی خاں کے مہاجن امی کرن سے دو ہزار روپے لے کر اور زادِ سفر سے لیس غالبؔ کلکتے کے سفر پر روانہ ہوئے۔(ص:۴۴)

خلیق انجم صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے یہ تمام معلومات صالحہ بیگم قریشی کی کتاب ''باندہ اور غالبؔ'' سے حاصل کی ہیں:

> ''غالبؔ کے سفر باندہ اور قیام باندہ پر محمد مشتاق شارقؔ کا ایک مقالہ اور صالحہ بیگم قریشی کی ایک کتاب چھپی ہے۔اس کتاب اور مضمون میں پہلی بار غالبؔ اور باندے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ میں نے یہاں اس مضمون اور کتاب سے استفادہ کیا ہے''۔(ص:۴۱)

خلیق انجم صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۹۹۴ء میں شائع ہونے والی صالحہ بیگم کی کتاب میں پہلی بار غالبؔ اور باندے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ یہ اطلاع بالکل دُرست ہے۔البتہ مذکورۂ بالا کتاب کے تعلق سے یہ عرض کرنا ہے کہ اس کا کچھ مواد خاکسار نے اُنھیں مہیا کیا تھا، جس کا اعتراف محترمہ نے پیش لفظ میں کیا ہے:

> ''---میں اپنے بزرگ پروفیسر محمد انصار اللہ، ڈاکٹر صغیر افراہیم (علی گڑھ) جناب کالی داس گپتا رضا (بمبئی) کی بے حد شکر گزار ہوں کہ ان کے ذریعہ فراہم کی گئی معلومات کا میں نے اس مضمون میں بھرپور استعمال کیا ہے''۔(ص:۲۰)

یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں پہلی یہ کہ محترمہ نے نہایت محنت و مشقت سے کام کیا ہے۔ دوسری بات مواد کی فراہمی تو وہ موضوع سے دلچسپی اور گھریلو تعلقات پر مبنی ہے۔ صالحہ بیگم کے والد احسان الحق قریشی جو ادبی حلقہ میں احسان آوارہؔ کے نام سے مشہور تھے، اُن سے خاکسار کی باندہ میں برابر ادبی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۹۰ء میں جب باندہ میں میری شادی ہوئی تو احسان آوارہؔ صاحب سیما بیگم یعنی ''مُحسن منشن'' کی طرف سے مدعو تھے لیکن باراتی کی حیثیت سے محض اِس وجہ سے ہمارے ساتھ ساتھ رہے کہ وہ میرے بزرگوں سے بخوبی واقف تھے۔ اگست ۱۹۹۰ء کے بعد باندہ میرا برابر جانا ہوتا۔ عموماً علی گڑھ سے اپنے وطن اناؤ، وہاں سے کانپور، بندکی ہوتے ہوئے باندہ پہنچتا۔ میرے پہنچنے کی اطلاع ملتے ہی احسان آوارہؔ صاحب کسی نہ کسی ادیب یا آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھنے والے فرد کے ساتھ پابندی سے آتے۔ اُن کی نشاندہی پر میں نے انھیں بہت سی معلومات فراہم کیں۔ اپنے گھر سے، بھوپال میں اشتیاق عارف، کانپور میں سید ابو محمد ثاقب، ابوالخیر کشفی، ابوالحسنات حقی سے، غالبؔ اور متعلقینِ غالبؔ کے تعلق سے۔ غرض کہ احسان صاحب تحقیق، تدوین اور ترجموں کی نسبت سے کچھ نہ کچھ مواد مجھ سے منگوایا کرتے تھے اور اس کا ذکر بھی اپنی نگارشات میں ضرور کرتے تھے۔

جملۂ معترضہ سے دامن بچاتے ہوئے عرض ہے کہ غالبؔ لکھنؤ سے کانپور کیسے، کس طرح اور کتنے دن میں پہنچے۔ غور کیجیے فاصلہ محض پچیس تیس کوس کا۔ راستہ باندہ کے بہ نسبت بہت بہتر اور چہل پہل کا۔ سفر کے تعلق سے علاقے کے زمینی حقائق سے ناواقفیت کی بنا پر اِس سفر کو قلم بند کرنے والے ادیبوں میں ضمنی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جن کے ازالہ کی کبھی کبھار کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ یہ مضمون اُسی کی ایک کڑی ہے۔ ممکن ہے مطلع صاف ہو سکے۔

۱۔ غالبؔ دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے۔

۲۔ کانپور پہنچ کر بیمار ہوئے، اور وہاں کئی دن قیام کیا۔

۳۔ سر چارلس مٹکاف (دلّی کے ریزیڈنٹ) سے ملاقات میں ناکام ہونے کے بعد مزید اُمید کی توقع پر لکھنؤ چلے گئے۔

۴۔ اودھ اور دبستانِ لکھنؤ کو قریب سے دیکھنے، احباب سے ملنے کی ایک دبی

دبی خواہش بھی تھی۔

۵-　وہاں وہ غازی الدین حیدر[۱] اور آغا میر[۲] سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔

لکھنؤ کے دانشوروں نے غالبؔ کی پذیرائی کی۔ وہاں انھوں نے دوڑھائی ماہ کے قیام میں محسوس کیا کہ لکھنؤ کی ریزیڈنسی (Residensy) میں بیٹھا ہوا ریزیڈنٹ صرف انگریز کمپنی کا بہی خواہ ہے۔ دربار کی ریشہ دَوانی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ایسے میں غالبؔ کی جن سے اُمیدیں وابستہ تھیں اُن کی سرد مہری نے انھیں اپنے عزیزوں[۳] خصوصاً نواب باندہ، ذوالفقار علی بہادر (۱۸۰۰ء- ۱۸۴۹ء) کی یاد دلائی۔ جغرافیائی صورت حال کے اعتبار سے اُس وقت کے مروجہ ذرائع سفر اور راستوں کا جائزہ لیں تو لکھنؤ سے باندہ کے لیے دو[۲] راستے تھے۔ ایک پوروا، مَوراواں، کانپور، فتح پور ہوتے ہوئے اور دوسرا نیوتنی، صفی پور، کانپور، فتح پور، باندہ۔ جگت موہن لال رواںؔ کے دادا بخشی مہی لال جو پوروا، مَوراواں کے بااثر شخص تھے، اُن کے مطابق غالبؔ ''ہمارے علاقے سے نہیں گئے تھے۔ جب کہ یہ قریب کا راستہ تھا''۔[۴] وہ نیوتنی سے کانپور پہنچے۔ پروفیسر انصار اللہ کے مطابق نواب پٹکاپور کے یہاں شب بھر قیام کیا۔ اسی طرح انھوں نے کانپور سے باندہ کے لیے گھاٹم پور، ہمیر پور کے قریب مگر مخدوش راستے کے بجائے فتح پور سے چلّہ تارہ (جو، اب چلّہ گھاٹ کہلاتا ہے) والے راستے کا انتخاب کیا۔

غالبؔ اپریل ۱۸۲۷ء کے پہلے ہفتہ میں دہلی کی حدود سے باہر نکلتے ہیں۔ تھکن سے چُور، سفر سے پریشان، مقصد کے حصول کی خاطر چند دن کانپور میں قیام کرتے ہیں۔ (ملحوظ رہے کہ کانپور میں یہ چند دن کا قیام لکھنؤ جانے سے پہلے کا ہے، لکھنؤ سے واپسی پر وہ یہاں صرف ایک دن ٹھہرتے ہیں۔) لکھنؤ میں تقریباً ڈھائی ماہ گزار کر اواخر جون میں باندہ کا قصدِ سفر کرتے ہیں، جہاں کا نوتپا مشہور ہے۔ لکھنؤ میں انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ اِن ایام میں وہاں کے لوگ عموماً گھر سے باہر نہیں نکلتے ہیں لیکن کج کلاہی شان رکھنے والے نازک مزاج شاعر غالبؔ چاہت، اُنسیت اور ضرورت کے پیش نظر تمام صعوبتیں برداشت کرنے کا عزم کرتے ہیں۔ یہ عزم اُن کی شخصیت کو مزید نکھارتا اور نگارشات میں ایک نیا جوش، جذبہ اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔

غالبؔ ۲۷/جون ۱۸۲۷ء (۲۶/ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ) بروز جمعہ علی الصباح لکھنؤ کو

الوداع کہتے ہیں اور ۲۹/جون بروز اتوار کانپور پہنچتے ہیں۔ ایک دن کانپور اور ایک دن فتح پور میں قیام کرتے ہوئے ۲/جولائی کی رات کے آخری پہر باندہ پہنچتے ہیں۔ تعمیر ہورہی عمارت[۵] کے پاس کچھ وقت گزارتے ہیں اور صبح دیوان محمد علی[۶]، صدر امین باندہ اپنی کوٹھی میں اُن کا استقبال کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ چوں کہ محمد علی صاحب شعر وادب سے شغف اور فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے، اِس لیے ممکن ہے موصوف مرزا کی شخصیت اور کلام سے غائبانہ واقف ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ غالبؔ نے لکھنؤ سے باندہ کے لیے جس راہ کا انتخاب کیا تھا، اُس کا ذکر میر کرم علی[۷] سے کیا ہو لہٰذا میر کرم علی اُنھیں سب سے پہلے دیوان محمد علی کے دولت کدہ پر لے کر آتے ہیں کہ وہ اُن کے وطن سے ہوتے ہوئے آرہے تھے۔ اسی لیے یہ قیاس آرائیاں اغلب ہیں ورنہ اُس طرح کے باقاعدہ شواہد موجود نہیں ہیں، جس طرح باندہ سے کلکتہ اور پھر واپسی کی مکمل روداد مکتوبات غالبؔ بنام دیوان محمد علی کی شکل میں دستیاب ہیں۔ اِس طرح سفرِ کلکتہ کی مکمل روداد کی بنیادی کڑی باندہ کے دیوان محمد علی قرار پاتے ہیں، جنھیں غالبؔ باندہ سے رخصت، اگلے پڑاؤ، قیامِ کلکتہ واپسی اور دہلی پہنچنے کے تعلق سے پل پل کی خبر دیتے رہتے ہیں، ورنہ باندے تک پہنچنے کے اِکّا دُکّا شواہد تھے جیسے غالبؔ کی یہ تحریر:

> ’’--- میرے بزرگوں اور نواب ذوالفقار علی بہادر کے باہمی بہت پُرانے تعلقات تھے۔ خود میرے دل میں بھی نواب کے لیے حد درجہ محبت اور لگاؤ تھا۔ اس لیے جوں توں گرتا پڑتا باندہ (بندیل کھنڈ) پہنچ گیا۔ یہاں میں تقریباً چھ ماہ رہا، نواب صاحب کے مکان پر[۸]۔ خدا کے کرم اور نواب موصوف کی ہمدردی اور تیمار داری اور توجہ سے مجھے اس خطرناک بیماری سے نجات ملی‘‘۔ (بحوالہ ذکرِ غالبؔ مالک رام، بار پنجم، ۱۹۷۹ء، ص:۴۲-۴۳)

(ii)

آمدِ باندہ اور انتخابِ راہ ہی نہیں غالبؔ کے افسانوی سفر کی مکمل تصویر سفرِ کلکتہ کے طویل عرصہ بعد اُبھر کر آئی ہے۔ یہ مسافت تقریباً ڈیڑھ صدی کو محیط ہے۔ نہایت واضح، صاف شفاف

اور رنگارنگ تصویر رہینِ منت ہے ''نامہ ہائے فارسی غالبؔ'' کی جو ۱۹۶۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔ Persian Letters of Ghalib کے شائع ہونے سے پہلے محمد علی کے نام غالبؔ کے آٹھ مختصر خطوط دستیاب تھے جن کے سہارے مذکورہ افسانوی سفر کے تانے بانے بُنے جاتے تھے اور شاید اسی بنا پر باندہ اور متعلقین باندہ کا ذکر برائے نام ہوا کرتا تھا لیکن سید علی حسن خاں اور سید محمد رفیع نقوی کا بے یارومددگار مسودہ جو خاک چھان رہا تھا، مرکزِ توجہ بنا۔ فارسی کے اِن نایاب خطوط کی تلاش سید اکبر علی ترمذی کی ہے اور اُنھیں سجانے سنوارنے کا کام لطیف الزماں خاں اور پرتؔو روہیلہ نے انجام دیا ہے۔

سفرِ کلکتہ کے ایک سو چالیس برس بعد منظرِ عام پر آنے والے دوسو ایک صفحات پر مشتمل اِس مجموعہ میں غالبؔ کے اکتیس[9] خطوط ہیں، جن میں ۲۹؍ دیوان محمد علی کے نام ہیں۔ فارسی میں لکھے گئے ان خطوط کے توسط سے، خاکسار نے دُھندلکے میں پڑی ہوئی اُن منتشر کڑیوں کو یکجا کیا ہے جن میں باندہ سے کلکتہ، قیامِ کلکتہ اور دہلی واپس آنے کی وہ رنگارنگ اور مؤثر داستان رقم ہے جو مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی شخصیت کو نکھارتے اور عہدِ غالبؔ کی نیرنگیوں سے واقف کراتے ہیں۔

ooo

حواشی

ا۔ ۱۸۱۴ء میں نواب سعادت علی خاں کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے غازی الدین حیدر، اودھ کے نواب کی حیثیت سے مسند آرا ہوئے۔ ۱۹/اکتوبر ۱۸۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا، اور موتی محل سے متصل نجف اشرف میں دفن ہوئے۔ اُن کے صاف ستھرے ادبی ذوق وشوق کی وجہ سے بھی غالبؔ شرفِ باریابی چاہتے تھے۔

۲۔ معتمد الدولہ نواب سید محمد خاں بہادر عرف آغا میر، نواب غازی الدین حیدر کے وزیر تھے لیکن تمام معاملات میں دخیل تھے۔ سازشوں کے عمل وردِ عمل کے نتائج میں معزول ہوئے۔ ۱۷/اکتوبر ۱۸۲۹ء کو بدظن ہوکر کانپور چلے گئے۔ ۷/مئی ۱۸۳۲ء کو کانپور میں انتقال ہوا۔ غالبؔ نے اُن کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کی اپنی الگ روداد ہے۔

۳۔ (i) مرزا جواد علی بیگ عرف مرزا مغل، غالبؔ کے بھانجے یعنی مرزا اکبر بیگ اور چھوٹی خانم کے بیٹے، جن کی شادی منورزمانی ولد منشی خلیل اللہ مفتیِ شہر دہلی سے ہوئی تھی۔

(ii) مرزا اُزبک جان، غالبؔ کے ماموں کے بیٹے جنھیں غالبؔ کی والدہ نے دودھ پلایا تھا۔

(iii) مرزا اسیر بیگ، غالبؔ کے ماموں۔

(iv) نواب ذوالفقار علی، مرزا غالبؔ کی سگی ممانی کی بہن کے بیٹے تھے۔

۴۔ مونوگراف، جگت موہن لال رواںؔ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء

۵۔ اُس زمانہ میں آبادی کے ایک طرف تالاب کو پختہ کرنے کا کام شروع ہو چکا تھا تو دوسری طرف بارہ دردی، فاصلہ، پرآگے کے حصہ میں نظر باغ (جہاں آج بازار بن گیا ہے) اور پُشت پر وسیع علاقے میں پھیلا ہوا عیش باغ تعمیر ہو رہا تھا جسے ۱۹۵۱ء میں اُتر پردیش حکومت کے محکمۂ آبیاری (Irrigation department) نے خرید لیا اور اب اُس میں ڈویژن آفس قائم ہے۔

۶۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں محمد علی صاحب کو مولوی محمد علی خاں لکھا ہے۔ شاید اِس وجہ سے کہ اُس زمانے میں دانش وروں، پڑھے لکھے افراد کو مولوی کہا جاتا تھا اور صاحبِ ثروت

شخص کے ساتھ خان بھی لگانے کا دستور بن گیا تھا۔ محمد علی نسلاً سید تھے۔ وطن صوبۂ اودھ کا مردم خیز خطہ نیوتنی تھا جہاں ابتداءً اُن کے بزرگوں نے قیام کیا پھر رفتہ رفتہ سندیلہ، ضلع ہردوئی منتقل ہو گئے۔ موصوف نے تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ والدہ قصبۂ موہان، ضلع اناؤ کے شیخوں کے خاندان سے تھیں، جہاں اب بھی اُن کی جائیداد موجود ہے۔ سندیلہ میں آج بھی محمد علی صاحب کا گھر 'دیوان صاحب کی کوٹھی' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ انگریزی سرکار کی جانب سے معمور عہدوں پر ترقی کرتے ہوئے دیوان یعنی وزیر کے منصب تک پہنچے۔ سرکاری ریکارڈ میں اُن کے نام کے ساتھ دیوان درج ہے۔

ے (i) نواب ذوالفقار علی کے خاص ملازم جن کی محل کے اندرون خانہ میں رسائی تھی۔
(ii) دیوان محمد علی انگریزوں کی جانب سے اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ نہایت دین دار اور بے حد سخی تھے۔ علی الصباح چہل قدمی کا شغل تھا۔ میر کرم علی، دیوان محمد علی کے چہیتے تھے۔ وہ صبح و شام اُن کی حویلی میں ضرور حاضر رہتے تھے۔

۸ نواب صاحب کے محل میں وہ برائے نام رہتے کیونکہ بیشتر وقت دیوان محمد علی کے ساتھ گزرتا۔ کلکتہ سے واپسی پر تو وہ باقاعدہ دیوان محمد علی کے گھر قیام پذیر رہے، صرف سلام کرنے محل حاضر ہوتے تھے۔

۹ نامہ ہائے فارسی غالبؔ (Persian Letters of Ghalib) میں سید اکبر علی ترمذی نے پانچ ضمیموں کے علاوہ چونتیس ۳۴ خطوط کا ذکر کیا ہے۔ ترتیب و تنظیم کے اعتبار سے مجموعہ میں ایک خط دو نثر پاروں کے ساتھ ہے۔ یہ نثر پارے کلکتہ میں غالبؔ کی ادبی محاذ آرائی کے بارے میں ہیں۔ ایک خط منشی سید علی حسن خاں کو اُن کے دوست سید افضل علی تحصیل دار کالنجر ضلع باندہ نے مذکورہ خطوط کی حصولیابی کے تعلق سے لکھا ہے۔ سید علی حسن خاں قصبہ آرا ضلع الٰہ آباد کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ہی ۱۸۳۹ء میں مذکورہ خطوط کو نقل کیا تھا۔ بقیہ ۳۱ر خطوط میں دو سید اکبر علی خاں طباطبائی اور ۲۹ر خطوط دیوان محمد علی کے نام ہیں۔

○○○

غالبؔ کے اہم ممدوح الیہ - دیوان محمد علی:

آثار وکوائف

(جنوری ۱۷۷۳ء - نومبر ۱۸۳۱ء)

شناسانِ غالبؔ کی اکثریت اب بھی دیوان محمد علی کی شخصیت سے کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتی ہے۔ ماہرینِ غالبؔ دیوان محمد علی کی سوانحی تفصیلات اور ان کے اکتسابات سے آگہی عام نہیں ہے کہ قدیم تذکرہ میں ان کا ذکر ضمنی طور پر کیا گیا ہے۔ ''نامہ ہائے فارسی غالب'' پر کام کرنے والوں (سید اکبر علی ترمذی، لطیف الزماں خاں، پرتو روہیلہ، تنویر احمد علوی) کو بھی ان کے سوانحی کوائف معلوم نہیں ہو سکے۔ یہ مضمون اس اہم علمی خلا کو پُر کرنے کی ادنیٰ سی کوشش ہے۔ ''پنج آہنگ'' اور ''کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالبؔ'' میں محمد علی سے متعلق جن القاب وآداب کا استعمال کیا گیا ہے ان سے غالبؔ کی نظر میں محمد علی کی اہمیت اور علمی حیثیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مکتوب نگار نے مکتوب الیہ کو جو القاب لکھے اُن سے عقیدت ومحبت، پاس ولحاظ، ادب اور احترام عیاں ہوتا ہے۔

(i) قبلۂ جان ودل، خدا آپ کو سلامت رکھے... (خط نمبر ۲)

(ii) قبلہ وکعبۂ دو جہاں کی خدمت میں ... (خط نمبر ۳)

(iii) دونوں جہاں کے قبلہ وکعبہ... (خط نمبر ۴)

(iv) اے قبلہ گاہ، اے بے کسوں کی پناہ... (خط نمبر ۵)

(v) آگہی کی سلطنت کے حاکم اور سالکوں کے مخدوم وپناہ گاہ... (خط نمبر ۹)

(vi) قبلہ پرستوں کے قبلہ اور جویانِ حق کے کعبہ... (خط نمبر ۱۰)

(vii) روح وخرد کے قبلہ اور اسد کے جسم وجاں کے کعبہ... (خط نمبر ۱۲)

۳۷ر خطوط میں سے کوئی بھی خط اُٹھا لیجیے میرے کرم فرما، میرے مخدوم، فیض مآب، مربیٔ بے کساں سے شروع ہو کر زیادہ حدِ ادب، مطیع وفرماں بردار جیسے جملوں پر ختم ہوتے ہیں۔

غالبؔ نے مکتوب الیہ کا جب بھی نام لیا ہے تو اُن کو مولوی صاحب یا محمد علی خاں کہہ کر مخاطب کیا ہے جب کہ محمد علی والد کی طرف سے سید اور والدہ کی جانب سے شیخ تھے۔ یعنی موصوف کا سلسلۂ نسب سیدوں اور شیخوں سے جڑتا ہے جن میں اکثریت سُنیوں کی تھی۔ ننھیال اور ددھیال کے بیش تر عزیز صوبۂ اودھ میں سکونت پذیر تھے اور آل رسول کے شیدائی تھے۔ والد اکبر علی قصبۂ سندیلہ، ضلع ہردوئی کے اور والدہ قصبہ موہان، ضلع اناؤ کی تھیں۔ ان دونوں جگہ اب بھی اُن کی جائیداد موجود ہے۔ خاص طور سے سندیلہ میں آج بھی محمد علی صاحب کا گھر ''دیوان صاحب کی کوٹھی'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

دیوان محمد علی نے فارسی اور عربی کی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی تھی۔ بائیس برس کی عمر میں وہیں سرکاری ملازمت مل گئی۔ جلد ہی چھترپور (بندیل کھنڈ) میں انگریزوں کی جانب سے مقرر ریزیڈنٹ کے میر منشی ہوئے۔ چار سال بعد صدر امین کے عہدے پر باندہ تعینات ہوگئے، اور پھر دیوان یعنی وزیر کے منصب تک پہنچے۔ محمد علی صاحب ستائیس (۲۷) سال کی عمر میں باندہ آئے اور عمر عزیز کے اٹھاون (۵۸) برس بھی مکمل نہیں کرنے پائے تھے کہ نومبر ۱۸۳۱ء میں انتقال ہوگیا۔ شہرِ باندہ اُنھیں اس حد تک پسند آیا کہ اسے وطنِ ثانی بنالیا اور زمین، جائیداد خریدی۔ سرکاری کچہری (موجودہ گورنمنٹ گرلس انٹر کالج) کی پُشت پر، بلکھنڈی ناکہ کے پاس ایک بڑی حویلی خریدی جو آج وہاں کے اہم بازار کے درمیان میں ہے اور یہاں اب بھی ان کے وارثین موجود ہیں۔ حویلی میں غالبؔ کے نام سے ایک وسیع کمرہ مختص ہے۔ دیوان صاحب اپنی بُردباری اور علم دوستی کی بنا پر مولوی اور مفتی کہلاتے تھے۔ صاحبِ حیثیت اور سخی ہونے کی وجہ سے انگریز اُنھیں خان بہادر کہتے تھے۔ سرکاری ریکارڈ میں اُن کے نام کے ساتھ دیوان درج ہے۔ لہٰذا میں نے مولوی یا خاں صاحب کے تخاطب سے گُریز کرتے ہوئے اُنھیں دیوان محمد علی لکھا ہے۔ انگریزی سرکار

سے پنشن یافتہ نواب باندہ، ذوالفقار علی سے اُن کے بے حد قریبی تعلقات تھے۔ نواب باندہ، اُن کے عزیز، انگریز افسران دیوان صاحب کی دُور رسی، دین داری اور مہمان نوازی کے قائل تھے۔ غالبؔ جب باندہ تشریف لائے تو اُن کی عمر تقریباً ۲۹ ربرس اور نواب باندہ ذوالفقار علی ۲۷ ربرس کے تھے جب کہ دیوان محمد علی عمر کے ۵۳ رسال گزار چکے تھے۔ انھوں نے اپنی رواداری اور گنگا جمنی تہذیب کو دمِ آخر تک نبھایا۔ موصوف کی قبر موجودہ گورنمنٹ گرلس انٹر کالج کے سامنے پدما کر چوراہے کے دائیں جانب، آبادی سے گھرے ہوئے قبرستان میں موجود ہے جس پر اُن کے نام کا کتبہ نصب ہے۔ کبھی یہ بہت بڑا میدان تھا۔ آپ کے خریدے ہوئے اسی میدان میں آپ کی تدفین ہوئی تھی۔ موصوف کی مزار سے ذرا فاصلہ پر ایک طرف ہنومان مندر اور دوسری طرف شیعہ حضرات کی مسجد ہے۔

جولائی ۱۸۲۷ء میں دیوان محمد علی کی ملاقات غالبؔ سے ہوئی اور نومبر ۱۸۳۱ء میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ قربت، رغبت اور پسندیدگی کا اندازہ صرف اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ محض چار سال میں غالبؔ نے موصوف کو جو خطوط لکھے اُن میں سے ۳۷ ردستیاب ہیں۔ دیوان صاحب کے عزیزوں کا کہنا ہے کہ اور بھی خطوط تھے جو خستہ حالت میں تھے اور جنھیں تقسیمِ ہند سے قبل جلد ساز کو دُرست کرا کے جلد بندی کے لیے دے دیئے گئے تھے۔ مگر اب اُن کا سراغ نہیں ملتا۔ توقع ہے کہ یہ سرمایہ کبھی نہ کبھی ضرور دستیاب ہو جائے گا کیوں کہ ان خطوط سے اُس عہد کا پورا منظر نامہ، تہذیبی، ثقافتی، تمدنی باتیں قارئین کے علم میں آسکتی ہیں۔

غالبؔ اور محمد علی کی پہلے سے جان پہچان یا خط و کتابت نہیں تھی۔ وہ باندہ مجبوراً اپنے عزیزوں سے ملنے، علاج کرانے اور اُن سے کلکتہ کے سفر کے لیے مالی امداد کی غرض سے تشریف لائے تھے، لیکن جس شخص کے وہ مُرید ہو گئے وہ دیوان محمد علی تھے۔ خطوط گواہ ہیں کہ نواب ذوالفقار علی، مرزا اُزبک بیگ اور مرزا مغل نے اُس حد تک نگہہ داشت نہیں کی جتنی شفقت اور محبت دیوان محمد علی سے ملی۔ تقریباً ایک ماہ بعد جب اُنھیں جسمانی تکالیف سے نجات ملی تو اُن کا بیشتر وقت دیوان صاحب کے ساتھ گزرتا۔ برسات کا لطف لیتے، سیر کے لیے محل سے تقریباً پانچ کلومیٹر مخالف سمت دریائے کین کے کنارے جاتے اور گھنٹوں لطف اندوز ہوتے۔ یہ ندی صاف شفاف پانی اور اُس میں

پائے جانے والے شجری پتھروں کی وجہ سے بیحد مشہور تھی۔ اب اُس کا پاٹ بہت کم ہو گیا ہے مگر شجری پتھر جو انگوٹھیوں اور دیگر زیورات کے علاوہ آرائش وزیبائش میں کام آتے ہیں، آج بھی دُور دُور تک بھیجے جاتے ہیں۔ نواب محل سے پہاڑی کی طرف یا پھر کین ندی کی جانب غالبؔ آتے، پُر سکون فضا میں دُور جانے والے عقیدت مندوں کو دیکھتے جن کا رُخ چتر کوٹ کی طرف ہوتا۔ شری رام بن باس کے زمانے میں سیتاجی اور لکشمن کے ساتھ یہاں مقیم رہے، پری کرما کی۔ رحیم خانخاناں اپنے ایامِ گردش میں سکون کی خاطر یہاں تشریف لائے تھے ؎

چتر کوٹ میں رَم رہے رحیمن اودھ نریش

جیہہ پہ وِپدا پرت ہے وہ آوت یہ دیش

غالبؔ نے فارسی میں سب سے زیادہ خطوط دو[۲] حضرات کو لکھے۔ اپنے رفیق قدیم مولوی عبدالکریم کے بھتیجے مولوی سراج الدین احمد کو ۵۲/خط لکھے جب کہ صرف چار برس کے عرصہ میں دیوان محمد علی کو ۳۷/خط لکھے ہیں۔ (ابھی اور بھی خط دستیاب ہو سکتے ہیں) تعداد میں کم ہونے کے باوجود دیوان محمد علی اِس اعتبار سے فوقیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے کلکتہ میں مقیم اپنے عزیزوں کو کلکتہ خط لکھے کہ وہ غالبؔ کی ممکنہ تمام مدد کریں۔ اس کا اعتراف غالبؔ نے اپنے خطوط میں بار بار کیا ہے۔ مثلاً اپنے مرحوم بڑے بھائی سراج الدین علی (قاضی اعظم، صدر عدالت کلکتہ جن کا انتقال ۱۸۲۳ء میں ہو گیا تھا) کی بیگم اور اُن کے بھانجے مولوی سید ولایت حسن کو خط لکھے۔ مولوی سید ولایت حسن کلکتہ کی کچہری میں سرکاری ملازم تھے۔ بعد میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہوئے۔ خود غالبؔ نے اُنھیں تین خط لکھے۔ چچازاد بھائی سید نور الدین علی جو ریاست سہاول (فیض آباد) میں نائب وزیر (وکیل) تھے اور جن کے دوست کلکتہ کچہری میں تھے۔ انھوں نے نواب سید اکبر علی طباطبائی کو بھی خط لکھے کیوں کہ وہ مرحوم بڑے بھائی سراج الدین علی کے خاص دوست تھے۔ غالبؔ نے اُنھیں فارسی میں پانچ خط لکھے ہیں۔

دیوان محمد علی کے صرف ایک بیٹی فاطمہ تھیں جن کی شادی شیخ شفیع الزماں صاحب سے ہوئی۔ یہ شادی غالبؔ کے باندہ آنے سے کئی سال قبل ہو چکی تھی۔ شیخ شفیع الزماں صاحب کے بیٹے شیخ یوسف الزماں صاحب آنریری جوڈیشیل مجسٹریٹ تھے۔ اُن کا شمار باندہ بلکہ یوپی کے

اہم روسا میں ہوتا تھا اور انھوں نے انگریز حکومت کو کئی بار قرض دیا لہٰذا انہیں حکومت کی جانب سے ''نوٹ والے'' کا خطاب بھی ملا۔ یوسف الزماں نے نواب باندہ کی جائیداد کو انگریزوں کے قہر سے بچایا اور بعد میں اس کا بیشتر حصہ عوامی فلاح و بہبود کے لیے وقف کردیا۔ اُن کے ایک بیٹے مسعودالزماں اور دو۲ بیٹیاں عفت النساء اور عصمت النساء تھیں۔ خان بہادر مسعودالزماں کی پیدائش باندہ میں ۵/اپریل ۱۸۹۰ء میں ہوئی، ۶۸/برس کی عمر میں، ۲۰/جنوری ۱۹۵۸ء کو باندہ میں وفات ہوئی۔ ایم.اے.او.کالج علی گڑھ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ لندن چلے گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرکے ۱۹۱۴ء میں باندہ واپس آئے۔ وہ اپنے وقت کے معروف سیاسی لیڈر تھے۔ یوپی کونسل کے ممبر اور انگریزی حکومت میں وزیر بھی رہے۔ مسعودالزماں کے پانچ بیٹے انوار الزماں ایڈوکیٹ، ولی الزماں، اسعدالزماں، ہادی الزماں، اشرف الزماں (ڈاکٹر) تھے۔ عصمت النساء کی شادی ناظر یار جنگ بہادر (چیف جسٹس حیدرآباد ہائی کورٹ) سے ہوئی۔ اُن سے ایک بیٹی حامدہ اور تین بیٹے مظفرالدین، غازی الدین اور کمال الدین تھے۔ حامدہ کی شادی میجر جنرل حبیب اللہ سے ہوئی اور وہ خود بھی میدان سیاست میں سرگرم رہیں۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ یوپی کی وزیر، یوپی اسمبلی کی ممبر اور راجیہ سبھا کی ممبر رہیں۔ وہ اترپردیش اردو اکادمی کی دوبار چیرپرسن بھی رہیں۔ حامدہ حبیب اللہ کے بیٹے وجاہت حبیب اللہ جموں کشمیر کیڈر کے آئی اے ایس افسر اور قومی اقلیتی کمیشن کے سربراہ بھی رہے۔

شیخ مسعودالزماں صاحب کی دوسری بیٹی عفت النساء کی شادی مولانا عبدالماجد دریابادی سے ہوئی۔ اُن سے چار بیٹیاں ہوئیں۔ رافت النساء جن کی شادی حکیم عبدالقوی صاحب سے ہوئی۔ حمیرا خاتون کی شادی حبیب احمد قدوائی سے، زُہیرہ خاتون کی شادی پروفیسر ہاشم قدوائی سے اور زاہدہ خاتون صاحبہ عبدالعلیم قدوائی کی زوجیت میں آئیں۔ عفت النساء کے نواسوں نے علم، ادب، صحافت، اور تدریس میں شہرت حاصل کی۔ اس فہرست میں ڈاکٹر سلیم قدوائی (جے این یو)، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، پروفیسر شافع قدوائی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، نافع قدوائی (مشہور صحافی) اور رشید قدوائی (مشہور انگریزی صحافی اور مبصر) وغیرہ شامل ہیں۔ مسعودالزماں کی نواسی ریحانہ خاتون جن کی شادی گورکھپور میں ہوئی، اُن کے بیٹے عمیر

احمد کے کئی انگریزی ناول ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان سے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں The stay tell state ،Jimmy the terrorist (Penguin, 2010) Encounters (Tora Press, ،(Penguin India, 2009) Sense Terra (Short Stories, Pages Editor, 2008)،2008) شامل ہے۔ یہ سب دینی اور دنیاوی علوم میں ماہر، صاحب حیثیت، ادب دوست اور غالبؔ کے شیدائی ہیں۔

دراصل دیوان محمد علی کے سوانحی کوائف اور ان کے خاندان سے متعلق تفصیلات کا ذکر غالبؔ تحقیق کے ناخن پر قرض ہے اور یہ مضمون اس قرض کو چکانے کی اولین کوشش ہے۔ میں نے غالبؔ کے ایک ایسے ممدوح الیہ کو موضوع بحث بنایا ہے جن پر فراموش کاری کی دھند چھائی ہوئی ہے۔ توقع ہے کہ اس سے غالبؔ کے قیامِ باندہ کے بعض نادیدہ گوشوں تک رسائی ممکن ہو پائے گی۔

○○○

غالبؔ کے غیر معروف مکتوب الیہ کے دستیاب خطوط

(پنج آہنگ تا نامہ ہائے فارسی غالبؔ)

شناسانِ غالبؔ نے مرزا کے مکتوبات پر تو سیر حاصل گفتگو کی ہے، لیکن بدقسمتی سے مکتوب الیہ دیوان محمد علی[ا] صدر امین باندہ کے متعلق کسی نے تفصیلی معلومات درج نہیں کی ہیں۔ حالاں کہ ان کے نام غالبؔ کے ۳۷/خط موجود ہیں جن سے اُن کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر تحقیقی دقتِ نظری کے ساتھ اس جانب توجہ کی جاتی تو بہت سے تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی امور ہی نہیں، سیاسی اور معاشی حقائق بھی آشکارا ہوتے۔ دیوان محمد علی کے نام غالبؔ کے خطوط اولاً ''پنج آہنگ'' میں نظر آتے ہیں۔ ۱۲۶/فارسی خطوط پر مشتمل یہ اولین مجموعہ ۱۸۴۹ء میں قلعہ معلی کے مطبع سلطانی سے شائع ہوا۔ اِس میں دیوان محمد علی کے نام فارسی میں سات خط ہیں ۔ دوسری مرتبہ اپریل ۱۸۵۳ء میں یہ مطبع دارالسلام دہلی سے طبع ہوا جس میں ایک خط کا اضافہ ہے۔ شیخ محمد اکرام، احسان آوارہ باندوی اور انصار اللہ نظرؔ نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ جب غالبؔ نے ''پنج آہنگ'' مرتب کیا تو اس میں اشعار کے ساتھ فارسی خطوط شامل تھے۔ پھر مرزا علی بخش نے دوسری نثری تخلیقات کو یکجا کر کے ''پنج آہنگ'' مرتب کی۔ ''پنج آہنگ'' کو شائع کرانے کی روداد پر ڈاکٹر محمد یار گوندل نے تحقیقی وتنقیدی مجلّہ ''معیار'' نمبر ۷ (شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان- جنوری تا جون ۲۰۱۲ء) میں معروضی گفتگو کی ہے۔ وہ اپنے مضمون ''غالبؔ کے بعض بیانات کا تنقیدی جائزہ'' میں لکھتے ہیں:

''--- غالبؔ اپنی بعض تصانیف کے انطباع کے وقت اخبارات میں

منظوم اور نثری اشتہارات بھی دوسرے لوگوں کے نام سے بھیجا کرتے تھے۔ ایک اشتہار جو ''پنج آہنگ'' کی طباعت کے حوالے سے ہے، اسعد الاخبار آگرہ میں ۱۲؍مارچ ۱۸۴۹ء کو شائع ہوا۔ اشتہار کچھ یوں ہے:

''نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ مصنفۂ حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب، جو اپریل میں قیمت بھیج دے تین روپے اور جو بعد اس کے بھیجے چار روپے دینے پڑیں گے۔

مژدہ اے رہروانِ راہ سخن ۔۔۔ پایہ سنجانِ دستگاہِ سخن
طے کرد راہِ شوق زود ازود ۔۔۔ آن پہنچی ہے منزلِ مقصود
پاس ہے اب سواد اعظم نثر ۔۔۔ دیکھیے چل کے نظم عالمِ نثر
سب کو اس کا سواد ارزانی ۔۔۔ چشمِ بینش ہو جس سے نورانی
ہے یہ وہ گلشن ہمیشہ بہار ۔۔۔ بارور جس کا سرو، گل بے خار
اس سے اندازِ شوکتِ تحریر ۔۔۔ اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
تھے ظہوری وعرفی وطالب ۔۔۔ اپنے اپنے زمانے میں غالبؔ
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے ۔۔۔ اسد اللہ خاں غالبؔ ہے
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا ۔۔۔ سینۂ گنجینۂ گہر ہوگا
میں جو ہوں درپئے حصولِ شرف ۔۔۔ نام عالی ہے غلام نجف

مخفی نہ رہے کہ یہ اشتہار دہلی سے بہ سبیل ڈاک میرے ایک مخدوم والاشان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا ہے''۔ (اکبر علی خاں، ''غالبؔ اپنے معاصر اخبارات میں''، مضمون، نقوشِ غالبؔ ۱۹۶۹ء، ص ۶۴۲)

مذکورۂ بالا منظوم اشتہار ۳۳؍اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ اشعار بندش الفاظ اور انداز بیان سے غالبؔ کے فن کی غمازی کر رہے ہیں۔ ایسی شاعرانہ تعلّی شاعر کو زیب دیتی ہے۔ غیر کے اندر کسی دوسرے کے لیے ایسا جذبہ پیدا ہونا تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ منظوم اشتہار غالبؔ کا زائیدہ طبع ہے۔ غالبؔ نے اپنے خط بنام نواب علی بہادر مسند نشین باندہ میں لکھا ہے کہ:

''اگر پنج آہنگ میری تصنیف نہ ہوتی تو کہتا کہ یہ کتاب فارسی کے لیے
''قانون'' کا حکم رکھتی ہے اور دقیق و نازک نکات، نادر ترکیبوں اور فصیح
وشیریں الفاظ کا قیمتی ذخیرہ ہے''۔

قاضی عبدالودود نے یہ اشتہار اپنی کتاب ''مآثر غالب'' میں درج کیا ہے اور تعلیقات میں بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''قرائن سے واضح ہے کہ یہ اشتہار خود غالبؔ کا نظم کردہ ہے، اگرچہ غلام
نجف خاں کی طرف سے جو غالبؔ کے شاگرد تھے''۔

(معیار-جلد ۷، ص ۵۰)

ترتیب وتدوین کے مراحل سے گزرتے ہوئے ''پنج آہنگ''۔ 'پنج آہنگ' اور 'آہنگِ پنجم' پر خوب گفتگو ہوئی ہے۔ اس اہم کتاب کے حصہ اول میں فارسی خطوط نویسی کے متعلق تفصیلی بحث موجود ہے۔ حصہ دوم میں فارسی مصادر اور مصطلحات کا ذکر ہے۔ حصہ سوم میں منتخب فارسی اشعار پر خصوصی توجہ ہے۔ حصہ چہارم میں تقاریظِ کتب اور مضامین پر زور ہے اور حصہ پنجم کا مرکز و محور مرزا کے فارسی خطوط ہیں۔ وقفہ وقفہ سے چوتھے اور بالخصوص پانچویں باب میں اضافہ ہوتا رہا۔ بقول شیخ محمد اکرام:

''کتاب کا سب سے قیمتی جزو مرزا کے وہ فارسی خطوط ہیں جن کا بیشتر حصہ
۱۸۲۶ء سے ۱۸۵۲ء تک لکھا گیا۔ یہ خطوط غالبؔ کے سوانح نگار کے لیے
ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ اور کسی کتاب سے مرزا کی ان ستائیس سالوں کی
کوششوں مصیبتوں اور ان کے ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا، جتنا ان
خطوط کے مطالعہ سے''۔ (غالبؔ نامہ، ص:۹۲)

فروری ۱۹۶۹ء میں غالبؔ کی وفات کے سو برس مکمل ہونے پر اُن کی عظمت، اہمیت اور افادیت کو اُجاگر کرنے کے لیے ان گنت تصنیفی و تالیفی کام انجام دیئے گئے۔ افتتاحی اور توسیعی خطبوں میں رشید احمد صدیقی، مالک رام، قاضی عبدالودود وغیرہ جیسی قدآور شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ ''نقوش'' سے لے کر ''شبستان'' تک ہندوپاک کے بیشتر جرائد خاص نمبر نکالتے ہیں۔ اِس صد

سالہ جشن کے ماحول میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ کی ''غالبؔ ببلیوگرافی'' پرتھوی چندر کی ''مکتوباتِ غالبؔ'' اور پرتوؔ روہیلہ کی ''آہنگِ پنجم'' بھی شامل ہیں۔ سبھی نے کم وبیش اِس کا اعتراف کیا ہے کہ ''پنج آہنگ'' حصہ پنجم میں شامل فارسی خطوط کو اردو نثر میں منتقل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ پرتھوی چندر جنھوں نے اِس موضوع[۲] پر مدلل اور مفصل گفتگو کی ہے، وہ ''مکتوباتِ غالبؔ'' کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

> ''---واقعہ یہ ہے کہ 'آہنگ پنجم' خصوصیت سے اہم چیز ہے کیوں کہ اس میں غالبؔ کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے غدر سے قبل اپنے احباب اور عزیزوں کو لکھے تھے اور یہی ان کی کتابِ حیات کے اوراق ہیں کیوں کہ جب ہم ان خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو غالبؔ جیتے جاگتے، چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، روتے بسورتے، شکروشکوہ کرتے ہوئے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ۱۸۴۸ء سے بعد کے حالات وواقعات غالبؔ کے اردو خطوط میں تفصیل سے مل جاتے ہیں لیکن سفر کلکتہ ۱۸۲۶ء سے دوبار کی شاہی ملازمت تک کے حالات سے واقفیت کے لیے فارسی خطوط کی بہت اہمیت ہے۔ یہی وہ خطوط ہیں جن کے ذریعہ سے نواب احمد بخش کی لیت لعل پر پنشن کی اپیل کے لیے کلکتہ جانے کا اراد، لکھنؤ کا قیام، باندہ کی علالت، براہِ الہ آباد بنارس پہنچنا۔ افسران ایسٹ انڈیا کمپنی سے ملاقاتیں، کاربرآری کے لیے سفارشی ذرائع کا استعمال وغیرہ سب کچھ ان خطوط میں موجود ہے۔ کہیں کہیں ادبی وعلمی نکتے بھی پائے جاتے ہیں اور ظرافت کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ مزید یہ کہ بیان کی خوبی، عبارت کی روانی، فارسی لغات پر قدرت، محاورات کے استعمال کا سلیقہ، تشبیہ واستعارات کا اچھوتا اسلوب، زبان وادب کی کونسی خوبی ہے جو ان خطوط میں نہیں''۔ (ص ۸)

''پنج آہنگ'' کی اشاعتِ اول کے تقریباً ایک سو بیس[۱۲۰] سال بعد، نامہ ہائے فارسی (Persian Latters of Ghalib) جسے سید اکبر علی ترمذی نے ۱۹۶۹ء میں مرتب کیا،

اُس میں غالبؔ بنام محمد علی ۲۹؍خطوط شامل ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے کلیاتِ نثر غالبؔ (مشمولہ پنج آہنگ) جتنے بھی ایڈیشن آئے، ان میں دیوان محمد علی کے نام لکھے گئے فارسی کے محض ۸؍خطوط موجود ہیں۔ غالبؔ کی صد سالہ تقریبات کے پیش نظر پنج آہنگ (آہنگ پنجم)، آثار غالبؔ، باغِ دودر، متفرقاتِ غالبؔ، نامہ ہائے فارسی پر توجہ دیتے ہوئے اِن مجموعوں نیز شامل علمی، ادبی اور بے حد معلوماتی خطوط کے اردو میں کئی ادیبوں نے ترجمے کیے لیکن پرتو روہیلہ ('آہنگِ پنجم'،۲۰۰۴ء، غالبؔ کے منتخب فارسی مکتوبات ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۹ء، کلیاتِ مکتوباتِ فارسیِ غالبؔ، ۲۰۱۰ء)، لطیف الزماں (مکتوباتِ غالبؔ دسمبر ۱۹۹۵ء) اور تنویر احمد علوی (نقش نیم رُخ، ۲۰۰۲ء) کے تراجم زیادہ مشہور ہوئے ہیں۔ محمد انصار اللہ، سید محمد الیاس مغربی، محمد مشتاق شارق میرٹھی، صالحہ بیگم قریشی اور احسان آوارہ باندوی نے بھی اِس جانب توجہ دی ہے۔ یہاں مطالعہ کے لیے پرتو روہیلہ کے تراجم (کلّیاتِ مکتوباتِ فارسی غالبؔ مطبوعہ ۲۰۱۰ء) کو خصوصی زمرے میں رکھا گیا ہے۔ Cross check کے لیے دیگر محققین کے تراجم بھی پیش نظر رہے ہیں۔ پہلے چند خطوط کے اقتباس القاب و آداب کی جدّت و نُدرت کے اعتبار سے ملاحظہ کریں:

غالبؔ کا پہلا خط----

''اے خدا پرستوں کے محور اور اے حق کی تلاش کرنے والوں کے مرکز، خدا آپ کو سلامت رکھے، خاطرِ خطیر کو اپنی یاد دلانا حصول سعادت کے لوازمات میں تصور کر کے اظہار مراد نیاز کو میں کامیابی کی تقریب خیال کرتا ہوں---''۔

دوسرا خط دیکھیں:

''قبلہ جان و دل خدا آپ کو سلامت رکھے۔ آداب و کورنش کی ادائیگی کے بعد فدوی اپنا حال بیان کرتا ہے---''۔

تیسرا خط:

''جناب مولوی صاحب قبلہ و کعبہ دو جہان کی خدمت میں آداب و تسلیم۔ خدا آپ کے سایۂ عالی کو قائم رکھے۔ آداب و تسلیم کے بعد یہ عرض ہے کہ

خدا کا شکر ہے کہ ابھی میرے (وجود کی) مٹھی بھر خاکِ سیاہ سے خدا کی تجلّی کے فیضان کا رشتہ نہیں ٹوٹا ہے---''۔

چوتھا خط:

''جناب مولوی صاحب دونوں جہان کے قبلہ وکعبہ، خدا آپ کے سایۂ عالی کو قائم رکھے، ایک زمانہ ہوا کہ میری سانس اُس مرکزِ نکویاں کے سوزِ فراق میں شعلہ خیز اور میری پیشانی اُس آستانے کی آرزو میں سجدہ ریز ہے---''۔

خط نمبر ۸:

''میرے قبلہ گاہ اور ولیٔ نعمت کی خدمت میں، خدا ان کے سایہ عالی کو قائم رکھے۔ میں قربان جاؤں اور اپنی جان ان کے خاکِ پا پر نثار کروں۔ میں نہیں جانتا کہ کیا عرض کروں اور کس پردے سے تحریر کا آغاز کروں۔ نہ شکرانۂ یادآوری اختتام کو پہنچتا ہے اور نہ ہی قدر افزائی کا سپاس حیطۂ تحریر میں آتا ہے---''۔

خط نمبر ۹:

''آگہی کی سلطنت کے حاکم، اور سالکوں کے مخدوم و پناہ گاہ (خدا آپ کو) سلامت رکھے---''۔

خط نمبر ۱۸:

''قسم خدا کی، یہ عبودیت نامے لکھتے وقت ذوقِ حضوری میرے دل میں جوش مارتا ہے اس لیے القاب وآداب کی گنجائش نہیں رہتی۔ بہر حال اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیان بھی بے ربط ہو جاتا ہے۔ چوں کہ میری خواہش ہوتی ہے کہ تحریر میں بات چیت کی کیفیت ہو۔ مجھے نہ مضمون کی تقدیم وتاخیر کا خیال ہوتا ہے اور نہ درازیٔ سخن کی فکر ہوتی ہے۔ میں گفتگو کے نشیب وفراز کا مستانہ طے کرتا ہوں اور اس وادی میں بگ ٹُٹ چلتا ہوں۔ اب دل میں یہ

خلش ہے کہ میرا جو حال ہے، وہ آپ پر پوشیدہ نہ رہے---''۔

خط نمبر ۲۴:

''حضرت قبلہ گاہی، ولی نعمی مدظلہ العالی! (یہ فدوی) آپ پر قربان ہوتا ہے، اپنی جان اُس کف پاک کی خاک پر نچھاور کرتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ کیا عرض کرے اور کون سی تحریر کے پردے سے سر نکالے۔ آپ کی یاد آوری کا احسان بے کراں ہے اور آپ کی قدر افزائی کا شکریہ اندازۂ تحریر نہیں---''۔

خط نمبر ۲۵:

''حضرت قبلہ گاہی، ولی نعمی مدظلہ العالی! (یہ فدوی) کورنش بجالاتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ اس سے پیش تر چند مکتوبات ارسال کیے گئے ہیں۔ جانتا ہوں کہ ان میں سے ہر خط اپنے وقت پر آپ کی نظر سے گزر کر مقصد کی صورت کا عکاس ہوا ہوگا۔ اُس احوال کا بقیہ، جو ان اوراق سے تعلق رکھتا ہے، یہ ہے کہ---''۔

غور طلب ہے کہ جولائی ۱۸۲۷ء میں دیوان محمد علی کی ملاقات غالبؔ سے ہوتی ہے اور نومبر ۱۸۳۱ء میں اُن کا انتقال ہو جاتا ہے۔ پسندیدگی اور قربت کا اندازہ صرف اِس سے لگایا جا سکتا ہے کہ محض چار سال میں غالبؔ نے موصوف کو جو خطوط لکھے اُن میں ۲۷؍فارسی خطوط دستیاب ہیں۔ (اس اعتبار سے بھی مکتوب الیہ سر فہرست ہیں کہ انھیں اتنی کم مدت میں اتنے زیادہ خطوط لکھے گئے۔) لطیف الزماں خاں کی کتاب ''مکتوباتِ غالبؔ'' کے پیش لفظ میں قاضی عبدالودود فرماتے ہیں:

''جناب سید اکبر علی ترمذی نے غالبؔ کے فارسی خطوط دریافت کیے ہیں جو غالبؔ کے سفر کلکتہ کے بارے میں ہمارے علم میں اہم اور حقیقی اضافہ کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک جامع تعارف کے ساتھ اِن خطوط کو مرتب کیا ہے اور بڑی محنت سے شاعر کے بیانات کا تقابلی مقابلہ اُس خارجی شہادت سے کیا ہے جو حکومتِ ہند کے سرکاری رکارڈ میں موجود ہے۔ اُن

کی یہ کوشش قابلِ تعریف ہے کہ مختلف اثرات جو شاعر کے ذہن پر مرتب ہو رہے تھے اُن پر تحقیق کی ہے۔ اگر چہ کہ شاعر کے اُسلوب پر فورٹ ولیم کالج کے اثر کے بارے میں مجھے شبہ ہے علاوہ ازیں جناب ترمذی نے ان خطوط کو تاریخی ترتیب دینے میں بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے۔ اصل عبارت کے استقرار، اشخاص اور مقامات کے نام جو ان خطوط میں آئے ہیں ان کے تعین کے سلسلہ میں بڑی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے--- مجھے یقین ہے کہ غالبؔ پر تحقیق کے نئے اُفق کھلیں گے''۔(ص۵)

پروفیسر خلیق انجم ''غالبؔ کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ'' میں لکھتے ہیں:

''غالبؔ نے کلکتہ سے نواب محمد علی خاں کے نام جو خطوط لکھے ہیں اور جنھیں سید اکبر علی ترمذی نے 'نامہ ہائے فارسی غالبؔ' کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ غالبؔ کے سفرِ کلکتہ اور قیامِ کلکتہ کے حالات کے سلسلے میں اہم ترین مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں''۔(ص۴۳)

غالبؔ اور محمد علی کی پہلے سے کوئی جان پہچان، خط و کتابت نہیں تھی، اور یہ سلسلہ دیوان صاحب کے انتقال کے بعد منقطع ہو گیا۔ مذکورہ مکاتیبِ غالبؔ کے علاوہ دیوان محمد علی کے وہ خطوط بھی بے حد اہم ہیں جو انھوں نے اپنے عزیزوں [۵] کو اِس تاکید کے ساتھ لکھے تھے کہ وہ کلکتہ میں غالبؔ کی ممکن مدد کریں اور جس کا اعتراف غالبؔ نے اپنے خطوط میں نہایت محبت و خلوص کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً بیگم سراج الدین علی اور مولوی ولایت حسن کے علاوہ ہُگلی کے نواب سید علی اکبر خاں طباطبائی اور نور الدین علی، جو کاکوری کے رہنے والے تھے اور ریاست سہاول (فیض آباد) کے نائب وزیر (وکیل) تھے، کا تفصیلی ذکر ہے۔ دراصل یہ وہ احباب تھے جو غالبؔ کے تمام معاملات میں پوری دلچسپی لے رہے تھے، اور بقول سید اکبر علی ترمذی:

''اُن کی شائستگی، تہذیب، تمیز، طور طریق، وضعِ روش، برتاؤ اور سلوک سے بہت متاثر ہوئے اور کلکتہ سے جو خطوط باندہ کے مولوی محمد علی خاں کو

لکھے ہیں اُن میں ان کی تعریف لکھی ہے''۔ (ص ۲۱)

دیوان محمد علی کو لکھے گئے خط نمبر ۸/ کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

''سچ تو یہ ہے کہ اگر اس آوارگی کے ضمن میں آپ تک نہ پہنچتا تو میری خستگی کو مرہم اور میری شکستگی کو مومیائی کہاں سے ملتی۔ اگر رشتۂ انصاف ہاتھ سے نہ چھوڑوں تو میں سمجھتا ہوں کہ میر کرم علی[۶] کے سپاس سے کہ انھوں نے ہی مجھے اس آستانے کی نشاندہی کی ہے اور اس منزل پر پہنچانے کے لیے وہی خضر راہ بنے ہیں، عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ میں بھلا اِس لائق کہاں کہ جناب کے ملازموں کی مدح کرسکوں۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں ؎

تیری ثنا کے لیے خاموشی ہی ثنا کی انتہا ہے''۔

خط نمبر ۳/ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''--- دوسرے جو کچھ بھی آپ کی ہمدردی اور آپ کی رحم دلی کے شکر کے علاوہ کہا جائے وہ ہرزہ سرائی ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ اور ان عنایات کا اجر جو آپ نے محض فی سبیل اللہ بغیر کسی سابقہ شناسائی کے، مجھ جیسے بے حیثیت شخص پر کہ جسے ناکسی کا طریقہ آتا ہے اور جو بے کسی میں بھی اپنی مثال آپ ہے، روا رکھی ہیں اور اب بھی فرماتے ہیں، خدا اس دنیا کی رحمتیں عطا کرے۔ زیادہ حد ادب۔''

القاب وآداب کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ مذکورہ مکتوبات سے دیگر کیفیات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ خط نمبر ۶/ سے اُس عریضہ پر روشنی پڑتی ہے جو مولوی ولایت حسن صاحب کے خط میں منسلک کرکے ارسال کیا گیا تھا، اور کہیں تلف ہوگیا تھا۔ (شاید اِسے مرزا افضل بیگ[۷] نے غائب کروادیا تھا):

''--- دو ماہ پر دس دن اور چڑھ گئے کہ جناب کے گرامی نامے کی سیاہی چشمِ منتظر کے لیے سرمہ نہ بنی۔ ذی الحجہ کی پہلی تاریخ کی تحریر کردہ عرض داشت اور ماہِ مذکور کی آٹھویں تاریخ کا لکھا عریضہ جو مولوی سید ولایت

حسن صاحب کے خط میں منسلک کر کے ارسال کیا گیا تھا، کس طرح کہوں
کہ تلف ہوگیا اور جناب کی نظرِ پرورش آثار سے نہیں گزرا۔ کاش جناب
قبلہ گاہی کے دامن التفات پر میں تغافل کے بیل بوٹے کاڑھ سکتا کہ دل
اس پریشانی سے نجات پاتا---''۔

خط نمبر ۷ رمیں مقدمہ سے متعلق تاخیر کا سبب بیان کرتے ہیں کہ ولیم بیلی برما چلے گئے ہیں۔ دوسرے حکّام مالدہ، جو کلکتہ سے مشرق کی جانب ایک شکار گاہ ہے، سیر وشکار کو گئے ہیں اور میر منشی آٹھ ماہ کی رخصت پر دریا کے راستے لکھنؤ گئے ہیں:

''اس شہر کی دوسری خبروں میں سے یہ ہے کہ ولیم بیلی صاحب جو کونسل
کے جزو اعظم ہیں اور عہد سابق میں وائس پریزیڈنٹ بھی تھے، فی الحال
برہما (برما) چلے گئے ہیں اور لارڈ ولیم کونڈش بینٹنگ کہ طغرائے گورنری
اُن کا نقشِ نگیں ہے مالدہ، جو کلکتہ سے مشرق کی جانب ایک شکار گاہ ہے۔
سیر وشکار کو چلے گئے۔ صاحب خلق عمیم مولوی محمد عبدالکریم دفتر کدۂ فارسی
کے میر منشی آٹھ ماہ کی رخصت پر دریا کے راستے لکھنؤ روانہ ہوگئے۔ ممکن
ہے اب تک عظیم آباد پہنچ چکے ہوں---''۔

نجی معاملات کے ساتھ ساتھ ادبی گفتگو بھی مذکورہ خطوط میں موجود ہے۔ خط نمبر ۱۳ رکا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''---امید کرتا ہوں کہ جنابِ عالی مطلعِ مذکور کو بھلا کر یہ دو مصرعے اُس
کے نعم البدل کے طور پر لکھ لیں گے، دوسرے یہ کہ خدا گواہ ہے، وہ قصیدہ
جو میں نے آغا میر کی مدح میں لکھا ہے، میرے خاندان کے لیے داغِ
بدنامی ہے۔ اب لطف یہ ہے کہ ان ایک سو دس اشعار کو کاغذ سے مٹا بھی
نہیں سکتا (چوں کہ) نواب مُرشد آباد بھی سیّد زادے ہیں، اس قصیدے کو
ان کے نام سے شہرت دے رہا ہوں، اگرچہ میں ان کی خدمت میں اب
تک حاضر نہیں ہوا ہوں... لیکن ہمایوں جاہ کی مدح کرنا مجھے گوارا ہے۔

توقع کرتا ہوں کہ جب تک ممدوح کے نام سے مختص اشعار کو...(قیاسی:
اس قصیدے میں شامل نہ کرلوں) یہ قصیدہ کسی کو نہیں دکھائیں گے اور
بزرگوں کی طرح اپنے چھوٹوں کی عیب پوشی کریں گے۔وہ نوازش نامہ کہ
...(قیاسی: آپ مجھے ارسال کریں) اُس پر پتا اس طرح ہونا چاہیے۔شہر
کلکتہ، قریب چیت بازار، درشملہ بازار، نزدیک تالاب، اسد کو ملے۔
آرزوئے قدم بوسی کے علاوہ مزید کیا عرض کروں!

محمد اسد اللہ"۔

میر صفات علی خاں کی وساطت سے باندہ کے لالہ کانجی مل کا ذکر خط نمبر ۸/ میں موجود
ہے:

"---مخفی نہ رہے کہ یہ عریضہ ماہ رمضان کی چھٹی تاریخ کو تحریر کر کے اس
ہی روز میر صفات علی خان کی وساطت سے لالہ کانجی مل کو بھیج دیا گیا۔خدا
ان کو توفیق دے کہ وہ اپنے خط کے ساتھ منسلک کر کے باندہ بھیج دیں"۔

دیوان محمد علی کا اپنی بھاوج (بیگم سراج علی، قاضی القضاۃ، جن کا ۱۸۲۳ء میں انتقال
ہوگیا تھا) کے نام خط، جس میں غالبؔ کی ممکن مدد کے لیے کہا گیا تھا، اُس کا تفصیلی ذکر خط نمبر ۱۴/
میں موجود ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"---ایک صاحب برآمد ہوئے۔اور مجھے حرم سرا میں لے جا کر پردے
کے پیچھے بٹھا دیا۔ جناب بیگم صاحبہ نے عنایتاً براہِ راست مجھ سے بات
چیت کی اور قدرے آپ کا حال بھی پوچھا اور کچھ میری آوارگی کا مقصد
بھی معلوم کیا اور فرمایا کہ میرا بھانجا مولوی ولایت حسن (اس وقت)
موجود نہیں۔وہ جس وقت بھی آیا تو آپ کے پاس پہنچے گا اور آپ کے
ٹھہرنے کے لیے اسی عمارت میں انتظام کردے گا۔شملہ بازار شہر سے اور
سرکاری دفاتر سے دور ہے---"۔

عمر میں دو سال چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی صحت یابی کی اطلاع سے غالبؔ کو جو خوشی ملی

اُسے وہ اپنے مشفق دیوان محمد علی سے بانٹتے ہوئے خط نمبر ۱۴ر میں لکھتے ہیں:

"---اُمید کرتا ہوں کہ آپ بھی میری گزارش پر اس کو اپنا فرزند سمجھ کر خوش ہوں گے اور دُعا کریں گے کہ اس کی باقی وارفتگی زائل ہو جائے"۔

باندہ میں غالبؔ کے عزیزوں اور اُن کی خیر و عافیت کی اطلاع بھی مذکورہ خطوط سے ملتی ہے۔ خط نمبر ۱۵ر کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"---جی تو چاہتا تھا کہ چند سطریں اپنی پریشان حالی سے متعلق بھی تحریر کردوں لیکن چوں کہ سابقہ خط میں اس ضمن میں تھوڑا بہت پہلے ہی لکھ چکا ہوں اور اُس خط کا دوسرے خطوط کے برعکس جواب ہی نہیں ملا، یا (پھر ایسا ہوگا کہ) اس کا جواب مل گیا، (یعنی انکار ہو گیا) بہر صورت مقصد ایک ہی ہے۔ چنانچہ اس خط میں اُس کو نظر انداز کرتا ہوں لیکن اس عبودیت نامے کے ساتھ ہی ایک خط مرزا امیر بیگ خاں[9] کے نام، جو نواب ذوالفقار بہادر کے (خدا اُن کے اقبال کو قائم رکھے) خالو ہیں، کھلے لفافے میں بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس کو اچھی طرح جانچ کر اور خوب پڑھ کر مکتوب الیہ کو پہنچا دیں گے۔ عرضِ نیاز کے علاوہ کچھ کہنے کو نہیں!

محمد اسد اللہ"

خط نمبر ۱۶ر کا یہ طویل اقتباس ملاحظہ ہو:

"آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ میں فقیر کس بے سروسامانی کی حالت میں گھر میں جھاڑو پھیر کر وطن اور اہلِ وطن سے رخصت ہو کر جب باندہ پہنچا تو میں نے نواب صاحب سے دو ہزار روپے قرض مانگے... (قیاسی: جو انھوں نے) دے دیئے۔ میں نے دل میں سوچا کہ غالبؔ، یہ بھی غنیمت ہے، لے اور چل! اگر تیرے مقدمے کی سماعت کلکتے میں نہیں ہوگی... الٹے پیروں پلٹ کر، جامہ قلندری پہن کر، عالم گردی شروع کر دینا۔ بہر طور... ہو کر تھوڑی بہت جڑاول خریدی اور دشت وصحرا پار کرتا کلکتے پہنچ

گیا۔ جس دن پہنچا ہوں... (قیاسی: میرے پاس) چھ سو روپے (باقی) تھے۔ شعبان، رمضان، شوال اور ذی قعدہ تو گزر گئے۔ ذی الحجہ بھی آ گیا اگر آسمان سے کوئی بلائے ناگہانی نہیں ٹوٹتی تو (فی الحال) دو ماہ کے لیے میں روزی کی فکر سے آزاد ہوں۔ نواب صاحب سے دست گیری کی ایک موہوم سی امید تھی... (قیاسی: لیکن) آثار... (قیاسی: امید افزا نہیں ہیں) چوں کہ جب کبھی میں نے ایک خط آپ کو ارسال کیا تو پہلے ایک خط نواب صاحب اور ایک خط دوسرے دوستوں اور عزیزوں کو ... (قیاسی: بھیجا ہے) اگر آپ کی خدمت میں پانچ خط پہنچے ہیں تو اُن کے پاس بھی پانچ ہی خط پہنچے ہیں۔ لیکن کوئی آواز نہیں آئی اور کسی نے کوئی جواب ... (قیاسی: نہیں دیا) یہاں تک کہ میر کرم علی نے ساری گرمجوشی اور کو چک... ایک جواب بھی نہ بھیجا۔ جی میں آتا تھا کہ نواب صاحب سے (پھر) مدد مانگوں اور ایک ہزار روپیہ مزید قرض لے لوں، لیکن خفقان پیدا ہو گیا اور یہ توقع بھی خواب وخیال ہو گئی۔ امید کرتا ہوں کہ آپ زحمت کر کے اور اس سلسلے میں تھوڑی سی کوشش کر کے میر کرم علی کو اپنے پاس خلوت میں بٹھا کر اس سے دل کی بات اور اندر کے احوال اور ساری کھری کھوٹی معلوم کر لیں گے تا کہ پتا تو چلے کہ نواب صاحب... (قیاسی: نواب صاحب کے اقربا) کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔ میں نے نواب صاحب اور ان کے مقربین سے بھی اس مقدمے کو چھپا کر نہیں رکھا، بلکہ ہر مکتوب اور ہر عریضے میں لکھا ہے کہ... پرچم نواب علی جناب، پہاڑ کے مقابل ایک تنکا آ گیا ہے۔ میری مدد سے آپ دست بردار نہیں ہوں گے کہ (آپ کی) پشت پناہی... دشمن کو مٹا دینے والی (قیاسی: اعانت گیری کے زور پر) احمد بخش خاں اور ان کے بہی خواہوں کی بنیاد سے میں صدائے آفرین بلند کرا دوں گا (لیکن انھوں نے) کوئی التفات نہ کیا اور 'ہاں' یا 'نہ'

کچھ بھی نہیں کہا۔ یہاں پر ... (قیاسی: یہ غریب الدیار مایوس) اور بے بس ... (قیاسی: ہوگیا) اچھا خاصا دوستوں کی دوستی سے نکلا تو دشمنوں کی دشمنی میں پھنس گیا۔ غرض یہ (کہ) ... نواب کی سرکار کا حال میر کرم علی کے ذریعہ یا جس سے بھی (معلوم) کرسکیں اور جو کچھ (معلوم کرنا) چاہیں، حاصل کر کے اطلاع دیں اور ان خطوط میں سے (کسی) ایک خط کے جواب کو بھی غیر اہم نہ سمجھیں کہ دو ماہ کی مدت کچھ بھی نہیں ہے۔ مجبوراً اس جگہ سے اپنے ویرانے کو ... اس وادی میں لے جاؤں گا۔ جناب کے گرامی نامے کا انتظار ہے اور بس! ---"۔

خط نمبر ۱۷ کا آخری پیراگراف ملاحظہ ہو:

"امید کرتا ہوں کہ اس خط کا جواب جلد عنایت کریں گے اور حال احوال سے مجھے مطلع کریں گے۔ میر کرم علی کے لیے بھی ایک خط اسی لفافے میں رکھ رہا ہوں۔ آپکے ملازم اتنی زحمت کریں کہ میر صاحب کو بلالیں اور اس مکتوب کی تحریر ان کے گوش ہوش میں اس طرح ڈالیں کہ ان کی فکرِ الہامی کو دخل اندازی کی طاقت نہ رہے اور (مزید یہ ہے کہ) ان سے بزور جواب بھی حاصل کر کے اپنے گرامی نامے کے ساتھ مجھے بھیج دیں۔ بھائیوں، عزیزوں اور نور چشموں کو مراتباتِ لائقہ قبول ہوں ---"۔

خطوط کے اقتباسات اِس کے غماز ہیں کہ باندہ میں دیوان محمد علی کو وہ اپنا بزرگ، سرپرست، بہی خواہ سمجھتے تھے اور اپنے عزیزوں سے زیادہ اُن پر بھروسہ کرتے، بلا جھجک راز و نیاز کی باتیں کرتیں، مشورے لیتے، ضروریات کا اظہار کرتے تھے۔ خط نمبر ۱۷ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"---وہ مجھ پر ... قرض ہے۔ خواہ اس کی ادائیگی میں کروں یا آپ اس سے عہدہ برآ ہوں، اس سے میری خاک ساری کی کوئی نفی نہیں ہوتی اور اگر دوسری شق کو باور کرلیا جائے تو آپ کے ٹھیکے کے کاروبار کی ابتری اور اس میں آپ کے دشمنوں کو نقصان ہونے کا احتمال ذہن کو پراگندہ

کرتا ہے، لیکن چوں کہ ضرورت مجھ سے قوی تر ہے اور میں بہت زیادہ
کمزور ہوں (اس لیے) اس کے قبول کرنے میں...(قیاسی: عار محسوس
نہیں کرتا) اگر چہ میں جانتا ہوں کہ وقت کی ضروریات، سرکار کے
تقاضوں کی پریشانیوں اور اس قسم کے ہنگاموں کی دردِ سری میں یہ روپیہ
بھیجنا آسان نہیں تھا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر یہ رقم نہ پہنچتی تو میرا
حال ناگفتہ ہو جاتا---"۔

میر کرم علی کا گِلہ شکوہ اور بھائیوں کی بے پروائی خط نمبر ۱۹/ر میں ملتی ہے تو خط نمبر ۲۲/ر میں ہگلی کے حالات کے ساتھ سید علی اکبر خاں طباطبائی کی دلجوئی، محبت اور مروت کا ذکر ہے۔ مزید یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان کی چھوٹی لڑکی کی شادی عنقریب ہونے والی ہے جس میں ان کی شرکت کے لیے طباطبائی نے درخواست کی ہے۔ مرزا دیوان محمد علی کو لکھتے ہیں کہ میں نواب صاحب کے لیے بھی ایک خط بھیج رہا ہوں۔ کسی طرح سے اُنھیں اس کی بھی اطلاع پہنچوایئے کہ یہاں خاکسار کی کس طرح عزت افزائی ہو رہی تا کہ نواب صاحب کے علم میں آسکے اور وہ بھی میری جانب توجہ دے سکیں۔

نواب ذوالفقار علی اور مرزا غالبؔ کے مابین جو دُوری پیدا ہو رہی تھی، اُس کے متعدد اشارے مذکورہ خطوط میں ملتے ہیں۔ خط نمبر ۲۶/ر اور ۳۰/ر کے یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"---کاش، نواب ذوالفقار بہادر کو یہ توفیق ہو کہ وہ مزید ایک ہزار
روپیہ امین کرن (امی کرن مہتہ) سے دلوا دیں۔ سوچ رہا ہوں کہ استدعا
پر مشتمل ایک عرض داشت جناب نواب صاحب کی خدمت میں تحریر
کروں اور اسے اپنے خط سے منسلک کر کے جناب عالی کی خدمت میں
بھجوا دوں اور آپ اس کو دیکھ کر مرزا مغل بیگ کے چھوٹے بھائی مرزا
اوزبک[10] جان کو کہ اسی طرح بھائی ... (نامکمل)۔ اپنے پاس بلا کر اچھی
طرح سمجھائیں اور اس بات پر آمادہ کرلیں کہ وہ اس مقدمے کی درستی کا
اقدام کرے---(ص:۱۶۴)

ایک اور خط ملاحظہ ہو:

''--- بندگانِ خداوندِ نعمت، میری طرف سے اپنی خاطر جمع رکھیں کہ (میری) حالتِ اضطرار ایسی نہیں کہ مجبوراً... (قیاسی: قرض لینے پر) اصرار... کروں اور نواب کی بزم کے اراکین کے سامنے بھیک مانگنے کو ہاتھ پھیلاؤں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ آئندہ ان لوگوں سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کریں گے، لیکن اس راز کے پردے کے محرم بہتر سمجھتے ہیں---''۔ (ص:۱۶۹)

ناچاقی کی بنا پر غالبؔ نے کچھ عرصہ کے لیے نواب ذوالفقار علی کو خط لکھنا بند کر دیا تھا مگر اپنے دوسرے عزیزوں کو کبھی کبھار لکھتے رہتے تھے۔ البتہ دیوان محمد علی کی وفات (۱۸۳۱ء) کے بعد اُن کی بیٹی اور دیگر متعلقین کی خیر و عافیت ضرور معلوم کرتے رہتے تھے۔

نواب صاحب کو دیر میں سہی لیکن اس کا احساس ہو چکا تھا کہ غالبؔ اُن سے ناراض ہیں۔ اس لیے جب وہ اپنے کچھ خاص کام کے لیے دہلی گئے تو غالبؔ سے ملنے گئے۔ ولایت حسن کو لکھے ایک خط سے دونوں باتوں کی تائید ہوتی ہے:

''--- مخفی نہ رہے کہ ان دنوں نواب ذوالفقار علی خاں بہادر چند خاص آدمیوں کے ساتھ باندے سے دہلی آئے اور بلحاظ دوستیٔ دیرینہ میرے گھر بھی آئے، اور جب ہر قسم کی باتوں کے دوران سید نورالدین علی کی پرسش احوال بھی ہوئی تو (انھوں نے) مولوی محمد علی خاں کے پس ماندگان کے باندے میں نہ ہونے اور ان کے آپس میں پیکار و پرخاش کا حال اس طرح بیان کیا کہ میرا دل غمگین اور طبیعت مکدّر ہو گئی۔ مجبوراً دل کے اضطراب کو تسکین دینے کے لیے میں نے سوچا کہ حضرت مخدومی کے عطارد آثار قلم کی جنبش کے ذریعے میں اس سرگزشت سے آگاہی حاصل کروں اور اس گروہ کے باہمی نزاع کا سبب اور مخدوم زادۂ یتیم کے انجام کار سے واقف ہو جاؤں---''۔ (کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالبؔ، ص۱۱۶)

باندہ کے طویل قیام اور پھر تین ساڑھے تین سال تک مسلسل خط و کتابت نے مرزا کو دیوان محمد علی کے اِس حد تک قریب کر دیا تھا کہ وہ اپنی ذاتی زندگی اور نجی معاملات سے مطلع کرتے رہتے تھے۔ سفر کلکتہ اور وہاں کی مشغولیات کی علاوہ آگرہ اور دہلی کے معاملات ہوں یا بھائی یوسف کا ذکر۔ بیگم صاحبہ کے مشورہ ہوں یا راز و نیاز کی باتیں — قربت اور اپنائیت کے لیے خط نمبر ۲۷ / کا یہ آخری پیراگراف ملاحظہ ہو:

"--- میں اپنی چچی کا خط، جو دہلی سے آیا ہے، اس عریضے کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں، پڑھنے کے بعد پھاڑ دیں اور پانی اور آگ کے سپرد کر دیں!"۔

غالبؔ باندہ سے کلکتہ کی جانب بڑھنے کے احوال سے پوری طرح واقف کراتے ہیں اور جب کلکتہ سے واپس ہو رہے ہیں تو اُس کی تفصیل سے بھی مطلع کرتے ہیں: خط نمبر ۳۲ / کا یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

"--- دو ماہ میں باندہ پہنچ جاؤں گا اور اپنی جان جناب عالی کی خاکِ پا پر نچھاور کر دوں گا اگر عنایت نامہ ان دنوں میں ارسال کر دیا گیا ہے، یا میرے عریضے کے وارد ہونے سے پہلے سپردِ ڈاک ہوگا، لامحالہ ڈاک کے قواعد کے مطابق واپس آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا... (قیاسی: میرے اس) خط کے پہنچنے کے بعد (براہِ مہربانی) مجھے مزید کوئی خط نہ لکھیے گا۔ عزیزوں کو واجبات پہنچیں۔

مزید یہ کہ اگر میری غیر موجودگی میں کوئی خط میرے نام کا، یا جناب کے ملازموں کے نام کا، دہلی یا کلکتے سے جناب کی خدمت میں پہنچے تو اس کو پڑھنے کے بعد اپنے پاس محفوظ رکھ لیجیے گا کہ مجھ بے قرار کی یہی تجویز ہے۔ واضح رہے کہ دہلی سے جو خط آئے گا وہ برادرم مولوی محمد فضلِ حق[11] صاحب کا ہوگا اور کلکتے کا خط مخدومی مولوی سراج الدین احمد کی طرف سے (ہوگا) جو مولوی عبدالکریم کے بھتیجے ہیں اور وہ دفتر خانہ فارسی کے اراکین

ومعززین میں بھی شامل ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے ان بزرگ سے یہ درخواست کی ہے کہ اگر کوئی نئی بات ہو تو ایک خط چاہے میرے نام پر، اور چاہے مولوی صاحب قبلہ کے ملازموں کے نام پر لکھ کر باندہ بھیج دیا جائے اور اسی طرح کی ایک گزارش مولوی فضل صاحب کی خدمت میں بھی تحریر کی ہے۔ مقصود (اس سے) یہ ہے کہ جب میں باندہ پہنچوں تو مجھے دونوں جگہوں کے حالات، انتظار کی تکلیف کے بغیر، معلوم ہو جائیں (یہ ساری باتیں میں نے) آپ کو اطلاع دینے کی خاطر لکھ دی ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ اگر ان دونوں حضرات میں سے کسی ایک کا خط بھی آپ کو ملے تو اس کا جواب کاتب کو ضرور لکھیں گے کہ میں نے ان دونوں حضرات کو، ایک کو تقریر سے اور دوسرے کو تحریر سے، آپ کی ملاقات کا آرزومند اور آپ کی محبت کا شناسا بنا دیا ہے''۔

○○○

حواشی

۱۔ غالبؔ نے انھیں اپنے بیشتر خطوط میں مولوی محمد علی خاں لکھا ہے۔ وہ والد کی طرف سے سید اور والدہ کی جانب سے شیخ تھے۔ دیوان محمد علی اپنی بُردباری اور علم دوستی کی بنا پر مولوی اور مفتی کہلاتے تھے۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے وہ پہلے صدر امین اور دیوان کہلائے۔ سرکاری ریکارڈ میں اُن کے نام کے ساتھ دیوان درج ہے لہٰذا میں نے بھی اپنے مضمون میں انھیں دیوان محمد علی لکھا ہے۔

۲۔ پرتھوی راج کی ''فکرِ غالبؔ''، ''مثنویاتِ غالبؔ''، ''مرقع غالبؔ''، ''جاگیر غالبؔ''، ''نقشِ غالبؔ''، ''مکتوباتِ غالب'' اور دیوان غالبؔ کی ہندی شرح اہم کتابیں ہیں۔

۳۔ نامہ ہائے فارسی غالبؔ کے ترجمے کے لیے پرتو روہیلہ کے پیش نظر سید اکبر علی ترمذی کا وہ مرتبہ نسخہ تھا جو پہلی بار غالبؔ اکیڈمی نظام الدین، نئی دہلی ۱۳-انڈیا سے ۱۹۶۹ء میں طبع ہوا۔ اس کی تکمیل میں انھوں نے ماہرین غالبؔ سے برابر مدد لی ہے جس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ اس نسخہ کی اہم چیز مرتب کا چون (۵۴) صفحے کا انگریزی میں لکھا ہوا وہ دیباچہ ہے جو اِس کی اہمیت کو بڑھاتا اور متن کے سینکڑوں حقائق سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

۴۔ الفیصل ناشران وتاجران کتب، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور، دسمبر ۱۹۹۵ء

۵۔ دیوان محمد علی کے وہ عزیز جنھیں موصوف نے غالبؔ کی مدد کے لیے کہا:

(i) -سراج الدین علی ۔ دیوان محمد علی کے بھائی اور کلکتہ کی صدر عدالت میں قاضی القضاۃ، بعد میں قاضی اعظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ غالبؔ کے کلکتہ پہنچنے سے پانچ سال قبل، ۱۸۲۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

(ii) -مولوی سید ولایت حسن ۔ مرحوم سراج الدین علی کی اہلیہ کے بھانجے تھے اور کلکتہ کی کچہری میں سرکاری ملازم تھے۔ بعد میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہوئے۔ غالبؔ نے انھیں تین خط لکھے۔

(iii) -نواب سید اکبر علی طباطبائی۔ سید علی تقی کے بیٹے اور سید غلام حسین طباطبائی کے بھائی تھے۔ ان کے والد نے ہوگلی بندرگاہ کے قریب امام باڑہ تعمیر کروادیا تھا۔ ان کے بیٹے نے زائرین کے لیے امام باڑہ سے ملحق سرائے بنوائی۔ غالبؔ کے لکھے پانچ خط ان کے نام دستیاب ہیں۔

(iv) -نورالدین علی، دیوان محمد علی کے چچازاد بھائی تھے اور ریاست سہاول (فیض آباد) کے نائب وزیر (وکیل) تھے۔ ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد کاکوری میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

۶ نواب ذوالفقار علی کے ملازمِ خاص اور دیوان محمد علی کے یہاں صبح و شام حاضری دینے والے میر کرم کو دیوان صاحب بہت عزیز رکھتے تھے۔

۷ مرزا جیون بیگ کے چھوٹے بیٹے۔ اکبر شاہ ثانی کے وکیل کی حیثیت سے ۱۸۲۷ء میں کلکتہ گئے تھے۔ وہاں وہ اپنے بھانجوں کی دفاع میں غالبؔ پر زبردست حملے کرتے رہتے تھے۔ ان کی شادی حکیم مومن خاں مومنؔ کی بھانجی سے ہوئی تھی۔ ۱۵ر نومبر ۱۸۳۰ء کو کلکتہ سے دہلی واپس آ گئے۔ ۳ر اگست ۱۸۳۱ء میں انتقال ہوا۔

۸ سیٹھ جی کا پورا نام لالہ امی کرن مہتہ ہے۔ ان کے بزرگ لالہ عزت کرن مہتہ علی بہادر اوّل کے زمانے میں گجرات سے باندہ آئے تھے۔ یہ لوگ نوابین کے بینکرس تھے۔ نواب ذوالفقار علی نے غالبؔ کو لالہ امی کرن مہتہ سے دو ہزار روپیہ اپنی ضمانت پر بطور قرض دلوائے تھے۔ لالہ کا خاندان اب بھی باندہ کے محلّہ علی گنج میں موجود ہے۔

۹ مرزا غالبؔ کے ماموں۔

۱۰ مرزا مغل اور مرزا اوزبک جان غالبؔ کے ماموں کے بیٹے تھے۔ اوزبک جان کو غالبؔ کی والدہ نے دودھ پلایا تھا۔ غالبؔ کے قیامِ باندہ کے زمانے میں شاہی محل میں مقیم تھے۔

۱۱ مولانا کی پیدائش سر سید احمد خاں نے ۱۲۱۱ھ لکھی ہے۔ دہلی کے ریزیڈنٹ دفتر میں بطور سررشتہ دار ملازم تھے۔ وہ غالبؔ کے دوست ہی نہیں، مربی اور محسن بھی تھے۔

مکتوباتِ غالبؔ بنام محمد علی: معروضی مطالعہ

غالبؔ کے ۱۲۶ر فارسی خطوط کا اولین مجموعہ ''پنج آہنگ''[1] بقول غلام رسول مہر ۱۳ر رمضان ۱۲۶۵ھ مطابق ۲ر اگست ۱۸۴۹ء میں قلعہ معلیٰ کے مطبع سلطانی سے شائع ہوا۔ اِس میں دیوان محمد علی کے نام سات خط ہیں۔ دوسرا ایڈیشن اپریل ۱۸۵۳ء میں مطبع دارالسلام دہلی سے طبع ہوا جس میں موصوف کے نام لکھے گئے ایک خط کا اضافہ ہے۔ غالبؔ کے انتقال (۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء) کے بعد اس جانب توجہ دی گئی اور اُن کے دیگر خطوط کے ساتھ کلیاتِ نثر غالبؔ (مشمولہ پنج آہنگ) ۱۸۶۹ء میں نول کشور پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ۱۸۸۸ء تک اِس کے پانچ اور ایڈیشن سامنے آئے[2] ان میں دیوان محمد علی کے نام لکھے گئے غالبؔ کے وہی آٹھ فارسی خطوط موجود ہیں۔ لیکن ایک صدی بعد سید اکبر علی ترمذی کی تحقیق وتدوین سے منظر نامہ بدلتا ہے۔ انھوں نے سید علی حسن خاں اور سید محمد رفیع نقوی کی کوششوں سے نقل کیا جانے والا، بے یارومددگار مسودہ جو عرصہ سے خاک چھان رہا تھا، تلاش کیا۔ انگریزی میں طویل اور مبسوط تعارف لکھا نیز بڑی عرق ریزی اور جستجو کے بعد ''نامہ ہائے فارسی غالبؔ'' (Persian Latters of Ghalib) کی شکل میں اُسے مرتب کیا، اور ۱۹۶۹ء میں پہلی بار غالبؔ اکیڈمی نظام الدین، نئی دہلی سے شائع کرایا۔ لطیف الزماں خاں، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور پرتو روہیلہ نے فارسی خطوط اور انگریزی کے طویل مقدمہ کو اردو قالب عطا کیا۔ محققین اور ناقدین خصوصاً پروفیسر انصار اللہ، پروفیسر حنیف نقوی اور پروفیسر شمیم حنفی نے اِس جدید دریافت پر کھل کر گفتگو کی۔ مذکورہ مجموعہ میں غالبؔ کے محمد علی کے نام ۲۹ر خطوط شامل ہیں۔ سید اکبر علی ترمذی نے لکھا ہے کہ یہ مخطوطہ نیشنل آرکائیوز دہلی نے ۱۹۶۰ء میں کٹڑا، مانک پور (الٰہ آباد) کے محمد رفیع نقوی سے حاصل کیا تھا جسے دیوان محمد علی کے گھرانے سے

قریبی تعلقات رکھنے والے سید علی حسن رسول جج ضلع باندہ نے ۱۸۴۰ء کے آس پاس تیار کیا تھا۔ پھر پرگنہ بدوسہ اور کالنجر کے تحصیل داروں خصوصاً سید محمد افضل کی وساطت سے یہ محمد رفیع نقوی تک پہنچا۔ میں یہاں غالبؔ کے دوسرے فارسی خطوط کے مجموعے ''باغِ دودر''، ''آثارِ غالبؔ'' یا ''متفرقات غالبؔ'' کا ذکر نہیں کر رہا ہوں کیوں کہ ان میں دیوان محمد علی کے نام کوئی خط نہیں ہے۔

فارسی مکتوبات کے اردو میں کئی ادیبوں نے ترجمے کیے لیکن پرتو روہیلہ، لطیف الزماں اور تنویر احمد علوی کے تراجم زیادہ مشہور ہوئے ہیں۔ محمد انصاراللہ، سید محمد الیاس مغربی، محمد مشتاق شارق میرٹھی، صالحہ بیگم قریشی اور احسان آوارہ باندوی نے بھی اِس جانب توجہ دی ہے لیکن پرتوؔ روہیلہ نے ''نامہ ہائے فارسی'' کے ساتھ ساتھ غالبؔ کے تمام فارسی خطوط کو ''کلیات مکتوباتِ فارسی غالبؔ'' کا عنوان دے کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے اردو ترجمہ کے ساتھ ساتھ فارسی مکتوبات کا متن اور مکتوب الیہم کے حالاتِ زندگی کو جس یکسوئی اور دلجمعی سے پیش کیا ہے اُس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ (تاہم انھیں بھی دیوان محمد علی کے احوال و کوائف نہیں مل سکے البتہ جو رسمی اطلاعات سید اکبر علی ترمذی اور حنیف نقوی کے توسط سے دستیاب ہو سکیں، درج کی ہیں۔) پیشِ نظر ۲۰۱۰ء کے اِس ایڈیشن میں پرتو روہیلہ نے غالبؔ کے اُن تمام ۳۷ر خطوط (۸ر پنج آہنگ، ۲۹ر نامہ ہائے فارسی غالبؔ) پر مدلّل گفتگو بھی کی ہے جو دیوان محمد علی کو لکھے گئے ہیں۔ جہاں جہاں ابہام پیدا ہو سکتا ہے، اُس کی وضاحت بھی کی ہے۔ مثلاً:

> ''---مختلف مجموعوں میں کئی خطوط ایک ہی مکتوب الیہ کے نام ہیں اور مشترک ہیں۔ معلوم ہوتا ہے غالبؔ نے دوسری اور تیسری طباعت میں ان کے متن کو تبدیل کر دیا ہے۔ اتفاق ایسا ہے کہ یہ خطوط مشترک ہوتے ہوئے بھی متن کے اعتبار سے اتنے مختلف ہیں کہ ان کو مشترک تصور نہیں کیا جا سکتا''۔ ص X

غالبؔ کی نظروں کے سامنے اشاعت میں شامل خطوط کا موازنہ (Persian Letters of Ghalib) اور پرتوؔ روہیلہ کی کلّیاتِ مکتوباتِ فارسیِ غالبؔ سے کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مرزا نے اپنے عہد میں ان خطوط کو شامل اشاعت کراتے ہوئے اس کے متن سے چھیڑ

چھاڑ کی اور اس کے کچھ حصّوں کو حذف کرا دیا تھا۔ اب وہ حذف شدہ حصّے قاری کے سامنے آ گئے ہیں تو مرزا کے باندہ تشریف لانے کی وجوہات کے ساتھ اُن کی سوچ اور حلقہ احباب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ نہ جانے کیوں مرزا نے انھیں حذف کر کے ان پر پردہ ڈال دیا تھا (یہ مزید تحقیق طلب نکتہ ہے[۴])۔ حالاں کہ اس سے نہ صرف ان کے بندیل کھنڈ سے رابطوں کا پتہ چلتا ہے بلکہ اُن کی شخصیت میں مزید نکھار آتا ہے۔ اِس کشاکش کو اُن کے خطوط کے توسط سے ہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نامہ ہائے فارسی غالبؔ مطبوعہ ۱۹۶۹ء کے پہلے خط کا ہم یہاں سب سے پہلے ذکر اس لیے کریں گے تاکہ دیوان محمد علی اور مرزا کے درمیان میر کرم علی[۵] کے کردار کو پیش کر سکیں۔ اس کا ذکر کُلّیاتِ نثر غالبؔ (مشمولہ پنج آہنگ) میں موجود نہیں ہے۔ غالبًا یہ خط نوابی مہمان خانے سے مرزا نے میر کرم علی کے ہاتھوں محمد علی صاحب کو بھجوایا ہوگا۔ مرزا تحریر کرتے ہیں:

> ''آ گہی کی سلطنت کے حاکم، اور سالکوں کے مخدوم و پناہ گاہ، خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ہدیۂ ثنا و نذر مدح کے بعد یہ عرض ہے کہ میر صاحب شفیق، میر کرم علی صاحب اکثر اوقات آپ کی طرف سے تشریف نہ لانے کا عذر کرتے رہتے ہیں، اور اس ناپسندیدہ صورت اور مذموم سیرت کی اپنی زبانِ گہرافشاں سے تعریف کرتے ہیں...''۔ (ص: ۱۲۷)

اس کے ساتھ مرزا نے دو طویل عریضوں کی نقول بھی منسلک کی ہیں جن میں ایک آغا میر وزیر نواب لکھنؤ کے نام ہے اور دوسرا مولانا فضل حق خیر آبادی کے نام۔ تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط و کتابت کا یہ سلسلہ مرزا نے باندہ ہی سے شروع کر دیا تھا۔ اب کلیات نثر غالبؔ (مشمولہ پنج آہنگ) ۱۸۷۵ء میں موجود فارسی خطوط کے ساتھ نامہ ہائے فارسی غالبؔ ۱۹۶۹ء میں موجود خطوط کا ذکر منظر نامہ کو اور بھی واضح کرتا ہے:

۱۔ مرزا کا یہ خط باندہ سے کلکتہ کی خاطر روانہ ہونے کے بعد باندہ ضلع کے قصبہ چلّہ تارہ سے تحریر کیا گیا ہے۔ مرزا سرائے میں تشریف فرما ہیں اور تحریر کرتے ہیں:

> ''...اس خط کو لے جانے والا شخص جو حسن اتفاق سے مل گیا خود اس بات کی گواہی دے گا کہ میں نے کن حالات میں یہ تحریر کیا ہے۔ بہر حال

جمعرات کو موڈا پہنچا۔ سنیچر تک آرام کیا اتوار کو چلا۔ ایک رات ایک گاؤں میں گزار کر دوسرے دن چلّہ تارہ پہنچا۔ خدا کا شکر ہے سر درد اور بخار جاتا رہا۔ آپ فکر مند نہ ہوں اطمینان رکھیں۔ آج رات چلّہ تارہ میں گزار کر خدا نے چاہا اور زندگی باقی رہی تو فتح پور کا راستہ بذریعہ سیج طے کرلوں گا''۔

نامہ ہائے فارسی غالبؔ میں یہ خط اسی طرح درج ہے لیکن کُلّیاتِ نثر غالبؔ اور نامہ ہائے فارسی غالبؔ کے ترجموں میں مترجم حضرات نے زمینی حقائق نہ جاننے کی بنا پر ''موڈا/موڈہ'' کو مودہا یا مودہ ترجمہ کیا اور سیج کو نہ سمجھنے کی بنا پر اسے ترجمے میں حذف کر دیا ہے۔ موڈہ دراصل باندہ شہر سے تقریباً دس میل شمال کی جانب، باندہ چلّہ تارہ روڈ پر واقع ہے۔ غالبؔ کی آمد یعنی ۱۸۲۷ء میں یہاں دو چار جھونپڑے، گھوڑے، بیل، اونٹ باندھنے کی جگہ اور ایک کنواں ضرور ہوگا کیوں کہ عموماً مسافر یہاں قیام کرتے تھے۔ یہ مرزا غالبؔ کا پہلا پڑاؤ تھا۔ وہ بڑی بیل گاڑی جسے یہاں لڑھی کہا جاتا ہے، سے سفر کر رہے تھے۔ تین ملازم، ایک کہار، ایک سائس اور گھوڑا و ساز و سامان ساتھ تھا۔ یہ خط مرزا نے ایک اجنبی مسافر کے ہاتھ روانہ کیا تھا لیکن اس مضمون کا ایک تفصیلی خط اور ہے جو چلّہ تارہ سے گاڑی بانوں کے ہاتھ دیوان محمد علی کو بھیجا گیا۔

۲- غالبؔ اُس میں لکھتے ہیں:

''قبلہ جان و دل سلامت۔ حال یہ ہے کہ بخار اور درد سر جو باندہ میں تھا، اب نہیں ہے۔ لیکن کمزوری باقی ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ کیوں کہ یہ میری زندگی کی ساتھی ہے اور وہ اپنی وفاداری نبھا رہی ہے۔ اب تو یہ میری فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ بہر حال موڈہ سے نکلا اور بیل گاڑی جس کو یہاں لڑھیا کہتے ہیں، جو عموماً سامان ڈھونے کے کام میں استعمال ہوتی ہے، اس پر چلا۔ کیوں کہ یہ مجھ سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ آہستہ آہستہ چلتی ہے ---''۔

نامہ ہائے فارسی غالبؔ میں شامل یہ خط موضوع کے اعتبار سے ویسا ہی ہے کہ جیسا کُلّیاتِ نثرِ غالبؔ میں لیکن ترتیب میں کچھ ردوبدل ہوا ہے لیکن آخر کی چند سطریں کلیات میں مرزا نے

شامل نہیں کی ہیں، انھیں حذف کرادیا ہے۔ جب کہ نامہ ہائے فارسی غالبؔ میں موجود ہیں۔ اس میں مرزا نے باندہ کے کچھ دوستوں کو سلام لکھا ہے۔ مرزا نے تحریر کیا ہے:

> ''جناب شاہ غلام زکریا صاحب اور خان انعام احمد خاں صاحب جن کے احسانات ہر خاص و عام پر ہیں اور جناب محمد صالح علی عرف مرزائی کے لیے میرا دلی سلام قبول ہو''۔

مرزا نے ایسا کیوں کیا؟ شاید وہ یہ پسند نہ کرتے ہوں کہ باندہ میں محمد علی یا نواب صاحب کے علاوہ کسی دوسرے کا نام آئے بہر حال وجہ جو بھی رہی ہو، مرزا نے ان سطروں کو حذف کرادیا، اب رہا سوال تعلقات کا، تو جہاں تک غلام شاہ زکریا کا ذکر ہے، یہ باندہ کے نزدیک موضوع کرئ شاہ میں موجود ایک شیعہ درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔ منیرؔ شکوہ آبادی جب باندہ میں مقیم تھے (۱۸۴۹ء تا ۱۸۵۸ء) تو ان کے بھی تعلقات کرئ شاہ کے سجادہ نشین سے تھے۔ اور ان کے صاحبزادے کی پیدائش پر انھوں نے تاریخی قطعات بھی تحریر کیے تھے جو کلّیاتِ منیرؔ میں حاشیہ پر درج ہیں۔ سجادہ نشین کا محمد علی صاحب کے پاس آنا جانا تھا۔ وہیں مرزا سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ رہے دیگر حضرات یہ بھی غالباً سرکاری ملازمین ہوں گے اور دیوان صاحب کے پاس اٹھتے بیٹھتے ہوں گے۔ مرزا نے باندہ سے چلّہ تارہ پہنچنے اور ناؤ کے ذریعہ سفر کا ذکر دوسرے خطوط میں بھی کیا ہے۔ لیکن وہ مرزا نے کُلّیاتِ نثرِ غالبؔ میں شامل نہیں کیے ہیں۔ لیکن نامہ ہائے فارسی غالبؔ میں یہ خطوط موجود ہیں۔ اس میں مرزا تحریر کرتے ہیں (۱): (خط نمبر ۳/۳، نامہ ہائے فارسی، ۱۹۶۹ء)

> ''---کہ چلّہ تارہ تک کیا بیتی اس کا حال دو خطوط میں بھیج چکا ہوں۔ ناؤ کے ذریعہ الٰہ آباد نویں روز پہنچا۔ حالاں کہ آنتوں میں ریاح بھر جانے سے بہت بے چین رہا---''۔

آگے چل کر الٰہ آباد سے ناراضگی کا ذکر ہے۔ وہ گاڑی کی تلاش میں دن گزار کر فوراً بنارس کے لیے چل دیتے ہیں۔ بنارس پہنچ کر پہلے ایک سرائے میں قیام کرتے ہیں۔ پھر ایک مکان میں کمرہ لے کر ٹھہر جاتے ہیں۔ وہاں ایک سو آٹھ اشعار پر مشتمل فارسی مثنوی ''چراغ دیر'' تصنیف کرتے ہیں۔ مرزا اسی خط میں آگے تحریر کرتے ہیں:

''---اگر چہ مقدمہ پنشن کا ہوتا اور میرے دل کو دشمنوں کی وجہ سے دکھ نہ ہوتا تو میں اپنے دین دھرم کو چھوڑ دیتا۔ تسبیح کو توڑ ڈالتا۔ گلے میں جینو ڈال کر گنگا کے کنارے ماتھے پر تلک لگا کر بیٹھا رہتا۔ اس وقت تک کہ میرے جسم کی گندگی ڈھل جاتی اور میں قطرہ قطرہ بن کر اس ندی میں گھل جاتا''۔

۳-یہ خط کُلّیاتِ نثرِ غالبؔ میں شامل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بنارس سے ہی لکھا گیا ہوگا اس میں مرزا بتاتے ہیں کہ یہاں کشتی بان ناؤ کے معاملے میں زیادہ پیسہ مانگتے ہیں۔ کوئی کلکتہ تک کے ۱۰۰ سو روپے مانگ رہا ہے اور پٹنہ تک کے بیس روپے سے زیادہ مانگتا ہے لہٰذا کیوں نہ گھوڑے پر سوار ہو کر راستہ طے کیا جائے:

''--- خدا آپ کو سلامت رکھے۔ مجھ ایسے انسان کے لیے جس سے آپ پہلے واقف بھی نہ تھے۔ اس پر اللہ کے واسطے سے بڑی مہربانیاں بنائے رکھیں۔ اور اب بھی آپ جس طرح ممکن بنے برابر مدد کر رہے ہیں۔ خدا آپ کو اس کا بدل عطا کرے گا''۔

لیکن یہ خط 'نامہ ہائے فارسی غالبؔ' میں نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے یہ مخطوطہ تیار کرتے وقت ضائع ہو گیا ہو۔ کیوں کہ 'نامہ ہائے فارسی غالبؔ' کا مخطوطہ باندہ میں منشی علی حسن خاں نے دیوان محمد علی خاں صدر امین باندہ کے وارثین سے اصل خطوط حاصل کر کے ان کی نقول سے تیار کیا تھا۔ اس لیے ممکن ہے کہ یہ خط اس میں انھیں نہ ملا ہو۔ لیکن اس خط سے یہ ثبوت ضرور ملتا ہے کہ مرزا کی محمد علی صاحب سے کوئی واقفیت نہ تھی۔ باندہ آ کر ہی ان سے تعارف ہوا تھا۔

۴-کلیات نثر غالبؔ ۱۸۷۵ء میں یہ فارسی خط شامل ہے۔ اس میں مرزا بنارس سے کلکتہ پہنچنے کا حال درج کرتے ہیں۔ جہاں انھیں پہنچتے ہی دس روپیہ ماہوار پر ایک کشادہ مکان مل جاتا ہے۔ دو روز آرام کر کے مرزا، نواب سید اکبر علی طباطبائی سے ملاقات کے لیے ہگلی بندرگاہ جاتے ہیں۔ اس مضمون کے ساتھ خط ختم ہو جاتا ہے، لیکن نامہ ہائے فارسی غالبؔ میں اس خط میں اور بھی کچھ تحریر ہے جس کو مرزا نے حذف کر دیا تھا۔ مرزا تحریر کرتے ہیں۔ نواب احمد بخش خاں

(جن کی سازش سے مرزا کو کم پنشن ملنے لگی تھی اور جس کے خلاف وہ کلکتہ جا رہے تھے) کے انتقال کی خبر آپ نے سنی ہوگی۔ حالاں کہ نواب صاحب کے مر جانے سے مقدمہ کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ کوئی نقصان لیکن اس وقت دو طرح کی فکروں میں مبتلا ہوں۔ یعنی اب بھائیوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ دوسری بات یہ کہ مستقبل میں جس فتح کا تصور کر رہا تھا وہ ختم ہو گیا۔ یعنی پنشن میں گھوٹالا کر کے رقم ہضم کرنے والے سے انتقام لینا اور محفل میں اس فتح کو بیان کر کے اس پر ناز کرنا، وہ نہ ہو سکا۔ انا کی تسکین اور مسلسل ستائے جانے کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرزا کو بہت دکھ تھا کہ نواب احمد بخش خاں مر کیوں گئے؟ زندہ رہتے تو وہ مقدمہ جیت کر ہر جگہ اس کا بیان کر کے اپنی تذلیل کا بدلہ لیتے اور لطف اندوز ہوتے۔ نواب مر گئے تو جیتنے کا سارا مزا جاتا رہا۔ مرزا یہ کیفیت اور اپنے دل کی بات دیوان محمد علی کو خط میں لکھ دیتے ہیں۔ لیکن چھپتے وقت اس کو انھوں نے حذف بھی کرا دیا یہ سوچے بغیر کہ اصل خط مکتوب الیہ کے پاس موجود ہوگا۔

۵- کُلّیاتِ نثرِ غالبؔ میں شامل یہ خط محمد علی صاحب کو تحریر کیا گیا ہے، خط کے شروع میں فارسی دانی کا ثبوت دیتے ہوئے مرزا ایک قطعہ کلکتہ کی تعریف میں تحریر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ''یہاں ہر شعبہ میں ایک خاص ماحول ہے جس نے میرے دماغ کو روشن کر دیا ہے۔ بنگال کی سرزمین کا عجیب انداز ہے---''۔

کلکتہ انگریزی کمپنی بہادر کی راجدھانی تھی۔ وہاں نئی روشنی کی ہر چیز انگلینڈ سے آ رہی تھی۔ نئی نئی ایجادات ظہور پذیر ہو رہی تھیں، جس سے ہندوستانی باشندے دلچسپی لینے لگے تھے۔ اسٹیمر چل رہے تھے۔ آمد و رفت کی سہولیات مہیا ہو گئی تھیں۔ اور پھر بانکی انگریز لڑکیاں مرزا غالبؔ کو اثر انداز کر رہی تھیں۔

اس خط میں مرزا کلکتہ میں اپنی کارروائیوں کا تذکرہ کر کے بات ختم کر دیتے ہیں، لیکن شائع ہوتے وقت خط کا وہ حصہ حذف کرا دیتے ہیں جس میں اُن کی باندہ کی کارگزاریوں کا احوال درج ہے:

''آپ کو معلوم ہے کہ فقیر کس حالت میں گھر پر جھاڑو پھیر کر اور اپنے وطن

دہلی اور وطن کے لوگوں سے رخصت ہوکر جب باندہ پہنچا تو میں نے
نواب صاحب (ذوالفقار علی بہادر) سے قرض حاصل کیا---"۔

مترجم و مرتب پرتوؔ روہیلہ نے خط نمبر۱۰/اور۱۱/ کے تعلق سے لکھا ہے:

"۱،۲-مضمون کے اعتبار سے یہ خط اور آہنگ پنجم کے خط-ایک (۱) اور دو
(۲) مشترک ہیں البتہ متن میں قدرے اختلاف ہے جو ترجمے سے بھی
ظاہر ہوتا ہے"۔ص:۱۳۲،کلیات مکتوباتِ فارسی غالبؔ

اسی طرح خط نمبر۱۳/ ۵ کے متعلق فرماتے ہیں:

"مضمون کے اعتبار سے یہ خط اور آہنگ پنجم کا خط۴/مشترک ہے لیکن متن
میں بہت اختلاف ہے جو ترجمے سے بھی ظاہر ہوتا ہے"۔ص ۱۳۸

خط نمبر۱۵/ ۷ کے بارے میں بھی درج ہے کہ:

"مضمون کے اعتبار سے یہ خط اور آہنگ پنجم کے خط نمبر ۶/ میں کافی
اشتراک ہے لیکن متن میں خاصا اختلاف ہے جو ترجمے سے ظاہر
ہوتا ہے"۔ص ۱۴۲

جب تک سید اکبر علی ترمذی کے توسط سے غالبؔ کے مزید خطوط قارئین کے سامنے نہیں آئے تھے تو ناقدین باندہ کی امداد و ضیافت کے تعلق سے بالواسطہ طور پر یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ غالبؔ موقع پرست، مطلبی، احسان فراموش تھے، لیکن تلاشِ جدید نے یہ ثابت کر دیا کہ غالبؔ مطلب برآوری کے لیے ضمیر کے خلاف کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے بلکہ خود کو احسان کے بوجھ تلے محسوس کرتے اور محسن کو ہمیشہ یاد رکھتے۔اس کا بین ثبوت کلکتہ سے واپسی کے سفر میں، راستہ سے دُور، سمتِ مخالف صرف اور صرف دیوان محمد علی کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے باندہ پہنچنا ہے۔اُن کا یہ منکسرانہ، مخلصانہ اور بے لوث عمل بھی اُن کے قول و فعل اور عادات و اطوار کو عیاں کرتا ہے۔ اس طرح خطوطِ غالبؔ بنام محمد علی، مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے جذبات و احساسات کے پاس و لحاظ کے ساتھ ساتھ شہر باندہ اور وہاں کی ادبی ہلچل کے بھی ضامن بنتے ہیں۔

○○○

حواشی

ا؎ ''پنج آہنگ'' کے تعلق سے شیخ محمد اکرام 'غالب نامہ' میں لکھتے ہیں:

''ابتداء میں جب غالب نے یہ مجموعہ مرتب کیا تو اس میں اشعار کے ساتھ فارسی نثر شامل تھی۔ مرزا علی بخش کو نثر جُدا گانہ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے میخانۂ آرزو میں جو نثر موجود تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے خطوط فراہم کر کے پنج آہنگ مرتب کی۔ اس کتاب کے شروع میں مرزا علی بخش کا اپنا دیباچہ ہے جس میں یہ تفصیلات درج ہیں۔ آہنگ اول میں فارسی خطوط نویسی کے متعلق وہ سطور ہیں جو غالبؔ نے سفرِ بھرت پور کے دوران میں لکھی تھیں۔ آہنگ دوم میں فارسی مصادر اور مصطلحات ہیں۔ آہنگ سوم میں مرزا نے اپنے فارسی دیوان کے کئی شعر انتخاب کیے ہیں۔ اور خطوط نویسی میں ان کا محل استعمال بتایا ہے۔ آہنگِ چہارم میں تقاریظِ کتب اور متفرق مضامین اور آہنگ پنجم میں مرزا کے فارسی خطوط ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خطوط کے فراہم کرنے میں کچھ دیر لگی اور ۱۸۴۰ء کے قریب یہ کتاب مرتب ہوئی۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس کا جو نسخہ ہے اس کی تاریخ طباعت ۱۸۵۳ء ہے۔ اس کے بعد آہنگ چہارم اور آہنگ پنجم میں اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن مرزا کے کئی خطوط غدر میں نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی سے ضائع ہو گئے تھے۔ اس لیے بقولِ غالبؔ 'پنج آہنگ' نامکمل ہے۔ اور اس کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں''۔

شیخ محمد اکرام مزید لکھتے ہیں:

''آہنگ دوم میں فارسی صرف ونحو کے معمولی قواعد ہیں۔ آہنگ سوم کے اشعار ادبی خوبیوں کے علاوہ اس لیے بھی کارآمد ہیں کہ ان سے کئی فارسی غزلوں کی تاریخ تصنیف تعین کی جاسکتی ہے۔ اور اس کے علاوہ مرزا کے اپنے قلم سے ان کے اشعار کا مفہوم اور محل استعمال پڑھنا بے حد دلچسپ ہے۔ کتاب کا سب سے قیمتی جزو مرزا کے وہ فارسی خطوط ہیں جن کا بیشتر حصہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۵۲ء تک لکھا گیا۔ یہ خطوط غالبؔ کے سوانح نگار کے لیے ایک بیش بہا خزانہ

ہیں اور کسی کتاب سے مرزا کی ان ستائیس سالوں کی کوششوں، مصیبتوں اور ان کے ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا، جتنا ان خطوط کے مطالعہ سے۔ ہم نے 'غالب نامہ' میں دوسرے تذکروں سے زیادہ مفصل اور صحیح حالات لکھنے کی کوشش کی ہے۔---اس کے لیے مرزا کے فارسی خطوط بہت مفید ہیں جو ان کی عمر کے ایک بڑے حصے کی کم وبیش ایک مکمل تاریخ ہیں اور جو اس وقت لکھے گئے جب کہ مرزا کو یہ حالات درپیش تھے۔اس شخصی اہمیت کے علاوہ مرزا کے فارسی خطوط اس لیے بھی دلچسپ ہیں کہ ان کے مطالعہ سے اس زمانے کی کئی ممتاز ہستیوں سے شناسائی ہوجاتی ہے، جن لوگوں کے نام مرزا نے خطوط یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کی فہرست بہت پُرشکوہ ہے۔اور اس میں اس زمانے کے اکثر برگزیدہ آدمیوں کے نام آجاتے ہیں''۔(ص:۹۰-۹۳)

۲؎ ۱۸۷۱ء کے ایڈیشن میں ۱۴۷ خطوط ہیں۔
۱۸۷۳ء کے ایڈیشن میں ۵۵۶ خطوط ہیں۔
۱۸۷۵ء کے ایڈیشن میں ۴۱۳ خطوط ہیں۔
۱۸۸۴ء کے ایڈیشن میں ۱۴۷ خطوط ہیں۔
۱۸۸۸ء کے ایڈیشن میں بھی ۱۴۷ خطوط ہیں۔

کئی خطوط مشترک ہیں۔ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی بھی اسی لیے رہی کہ فارسی کے تمام خطوط کو، بغیر چھان بین کے، مرتبین نے اپنی سہولت اور ناشر کی پسند کے اعتبار سے ترتیب دیا۔

۳؎ پرتوؔ روہیلہ کا اصل نام مختار علی خان اور والد کا نام محمد حمایت اللہ خاں ہے۔ وہ ۲۳/نومبر ۱۹۳۲ء میں بریلی (اُتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ابتدائی اور ثانوی تعلیم بریلی اور رامپور میں ہوئی۔۱۹۵۰ء میں والدین کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ پشاور یونیورسٹی سے بی.اے. (آنرز، فارسی)، ایم.اے. فارسی اور ایل.ایل.بی. کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۵۷ء میں اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔۱۹۷۹ء میں انکم ٹیکس کمشنر اور ۱۹۹۰ء میں ریجنل کمشنر انکم ٹیکس لاہور مقرر ہوئے۔۱۹۶۵ء میں صوبہ سرحد میں شادی ہوئی۔ بیٹے کا نام محمد علی خاں ہے۔

ادبی ذوق وشوق کا مظاہرہ طالب علمی کے زمانے سے ہوتا رہا ہے۔ایک پشتو اور ایک فارسی شاعری کے علاوہ چھ اردو غزل ونظم کے مجموعے، ایک سفرنامہ، ایک دوہے کا مجموعہ نیز چار غالبؔ سے متعلق کتابیں ہیں جن پر درجنوں انعامات واعزازات ملے ہیں۔جمیل جالبی صاحب سے خاص عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔سنٹرل بورڈ آف ریونیو سے بہ حیثیت ممبر سبکدوش ہونے کے بعد غالبؔ کے فارسی مکتوبات پر خصوصی توجہ دی۔دس بارہ برس کی مسلسل جدوجہد رنگ لائی۔'کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالبؔ' اُن کی کاوش کا ہی نہیں،اعلیٰ فارسی دانی کا بھی منھ بولتا ثبوت ہے۔۲۹رستمبر۲۰۱۶ءکو۸۳سال کی عمر میں،اسلام آباد میں انتقال ہوا۔

۴۔ غالبؔ کی سیرت اوران کا کردار مثالی ہے۔لیکن تحریروں میں ردوبدل کی وجہ مصلحت اور دُور اندیشی قرار پاتی ہے۔مثلاً ''دستنبو'' میں شاہانِ تیموریہ سے اپنے یا اپنے بزرگوں کے تعلقات سے ممکن حد تک گریز برتا۔ جب انگریزوں کے سامنے بادشاہ سے تعلقات کو زیادہ اُجاگر نہیں کیا تو پھر باندہ کے نوابِ علی بہادر علی جو انگریزوں کی نظر میں باغی قرار پا چکے تھے،اُن سے کس طرح تعلق واضح کرتے۔وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے ضرورتاً قصائد میں ممدوحین کی تبدیلیاں، تحریفات کیں، اشعار میں بھی کچھ ترمیم وتنسیخ کی۔۱۸۶۱ء میں جب ان کا اردو دیوان شائع ہوا تو اس میں نو اشعار کا وہ قطعہ شامل نہیں کیا جس کا پہلا شعر ہے:

بس کہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا!

۵۔ میر کرم علی کو علی الصباح غالبؔ کے باندہ آنے کی اطلاع ملی اور وہ اُنھیں سب سے پہلے دیوان محمد علی کی حویلی میں لے کر گئے تھے۔میر کرم علی نواب ذوالفقار علی کے خاص ملازم جن کی محل کے اندرون خانہ میں رسائی تھی۔دیوان محمد علی انگریزوں کی جانب سے اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔موصوف وہاں بھی صبح وشام حاضر رہتے تھے۔

نواب شمشیر بہادر دوم

پیدائش ۱۷۷۸ء۔ وفات ۱۸۲۳ء
دورِ نوابی ۱۸۰۲ء سے ۱۸۲۳ء (۲۱ برس)

باندہ کے تعلق سے غالبؔ کا شعری سرمایہ

مذکورہ موضوع کے تعلق سے غالبؔ کا جو شعری سرمایہ دستیاب ہے اُس کو دو حصّوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ اول فارسی خطوط میں شامل کلام اور دوئم اردو کلام جسے محققین نے یکجا کیا ہے۔ دیوان محمد علی کو لکھے گئے مکاتیبِ فارسی کا مطالعہ کریں تو غالبؔ نے بیش تر خطوط میں مختلف اشعار، حکایات اور روایات سے اپنی روداد کو دلچسپ اور معلوماتی انداز میں پیش کیا ہے۔ خاص طور سے خط نمبر۱۲/اور ۱۳/میں یہ ہُنر خوبی سے جلوہ گر ہے۔ خط نمبر۱۲/میں ہجوِ الہ آباد کے ساتھ سرزمینِ بنارس کی بے پناہ تعریف ہے اور اس تفصیلی تعریف میں تاریخ، تہذیب اور ثقافت فنکارانہ ڈھنگ سے سمٹ آئی ہے۔ خط کا آغاز ہی اِس شعر سے ہوتا ہے ۔

این شکایت نامۂ آوارگی ہاے من است
قصۂ دردِ جدائی ہا، جدا خواہم نوشت

ترجمہ:[1] یہ (تحریر تو) میری آوارہ گردی کا شکایت نامہ ہے۔ دردِ فراق کی داستان علاحدہ لکھوں گا۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کرنے کا انداز دیکھیے ۔

میں دیوانہ ہوں جو کچھ بھی کہوں معاف ہے اور (چونکہ) دُکھی ہوں جو کچھ لکھوں نا قابلِ گرفت شاعری درکنار و تکلف برطرف، اپنی سرگزشت کے باب اظہار میں جو گفتنی ہے، وہ یہ ہے:

مغلوب سطوتِ شرکا، غالبِؔ حزیں
کاندرتنش زِ ضعف، تواں گفت، جاں نہ بود

ترجمہ: غالبؔ حزیں شرکا ے (سفرِ حیات) کی شان وشوکت سے اس طرح مغلوب ہو گیا ہے گویا ضعف سے اس کے جسم میں جان ہی نہیں تھی۔

گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است

مارا بہ ایں گیاہِ ضعیف ایں گماں نہ بود

ترجمہ: کہتے ہیں کہ وہ بنارس تک زندہ پہنچ گیا ہے۔ہمیں گھاس کے اس نحیف تنکے سے یہ توقع نہ تھی۔

اگر میں اس شہر کی، ایک سرے سے دوسرے سرے تک کی، عمارات کی کثرت کا بیان کروں (تو گویا یہ) سراسر مستوں کے عبادت خانے ہیں اور اگر (از...) اس کی نواح کے سبز و گل کی ایک فصل بھی پڑھوں (تو یوں لگے جیسے) بیابان در بیاباں بہارستان ہے ؎

تعالیٰ اللہ بنارس، چشمِ بد دُور

بہشتِ خرم وفردوسِ معمور

ترجمہ: سبحان اللہ، بنارس کو خدا نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔یہ بہشتِ سرسبز اور جنتِ معمور ہے۔

خس وخارش گلستاں است، گوئی

غبارش جوہرِ جاں است، گوئی

ترجمہ: اس کے جھاڑ جھنکاڑ بھی بمنزلہ گلستان کے ہیں (اور) اس کی گرد گویا جوہرِ جاں ہے۔

سروشِ[2] پائے تختِ بُت پرستاں

سراپا لیش زیارت گاہِ مستاں

ترجمہ: اس کے اطراف بت پرستوں کے تخت گاہ ہیں اور وہ (بذاتِ خود) سرتاپا مستوں کی زیارت گاہ ہے۔

بنارس را کسے گفتہ کہ چین است

زموجِ گنگ چینش برجبین است

ترجمہ: (جب) کسی نے کہا کہ بنارس چین (کی مانند) ہے، (تو اس تشبیہ سے) بنارس کے

ماتھے پر گنگا کی موجوں سے شکنیں پڑ گئیں۔

بخوش پُر کاریِ طرزِ وجودش
زدہلی می رسد ہر دم درودش

ترجمہ: اس کے طرزِ وجود کی خوش پُر کاری پر دہلی بھی ہر لمحے درود بھیجتی ہے۔

بنارس را تو گوئی دید در خواب
کہ می گردد زنہرش در دہن آب

ترجمہ: یوں لگتا ہے کہ اس (دہلی) نے بنارس کو خواب میں دیکھ لیا ہے، (جبھی تو) اس کی نہر سے (دہلی کا) دہن پُر آب ہے۔

حسودش گفتن آئین ادب نیست
ولیکن غبطہ گر باشد، عجب نیست

ترجمہ: (اس کی خوبیوں پر) بہت زیادہ حسد کرنا آئین، ادب کے خلاف ہے۔ البتہ رشک کرنا حیران کن نہیں۔

فرنگستانِ حُسنِ بے نقاب است
زِخاکش ذرّہ ذرّہ آفتاب است

ترجمہ: (یہ) حسنِ بے نقاب کا (وہ) فرنگستان ہے، جس کی خاک کا ذرہ ذرہ آفتاب ہے۔

بتانش راہیولٰی شعلۂ طور
سراپا نورِ ایزد، چشمِ بد دور

ترجمہ: اس کے حسین شعلۂ طور کی صورت ہیں۔ خدا انھیں نظرِ بد سے بچائے، سراپا نورِ ایزدی ہیں۔

میانہا نازک و دل ہا توانا
زنادانی بکارِ خویش دانا

ترجمہ: ان کی کمریں نازک (لیکن) دل توانا ہیں۔ وہ نادانی میں بھی اپنے کام میں (بڑے) دانا ہیں۔

تبسم بسکہ در دل ہا طبیعی است
دہن ہا رشکِ گلہای ربیعی است

ترجمہ: ان کے دلوں میں ایک فطری تبسم رہتا ہے (اور) ان کے دہنِ فصل ربیع کے پھولوں کے لیے باعث رشک ہیں۔

بلند افتادہ تمکینِ بنارس
بود بر اوجِ او، اندیشہ نارس

ترجمہ: بنارس کا مرتبہ (اتنا) بلند ہے (کہ) اس بلندی پر (انسان کی) فکر نہیں پہنچ سکتی۔

اس تماشا گاہ کی دل فریبی کے وفور سے غمِ مسافرت دل سے محو ہوگیا ہے اور اس بُت خانے کے نشاطِ نالۂ ناقوس کی کثرت سے دل جھوم جھوم کر (مستانہ وار) نعرہ زن ہے۔ (میرا) ذوقِ (حسن) بادۂ تماشا سے ایسا بدمست ہوا کہ وارفتگی میں یادِ وطن (کی شمع) بجھادی اور اس جگہ کے نظارے کی کیفیت دل پر اس حد تک غالب ہوگئی کہ دہلی کے لیے سوائے طاق نسیاں کے (اور کوئی) جگہ نہیں رہی... (اگر) یہ اہم مقدمہ پیش نہ ہوتا اور (میرا) دل شماتتِ اعدا سے زخمی نہ ہوتا تو بے درنگ دین کو خیر باد کہتا اور تسبیح توڑ ڈالتا اور (ماتھے پر) قشقہ کھینچتا اور (گلے میں) زنّار ڈالتا اور اس ہیئت کے ساتھ گنگا کنارے بیٹھا رہتا تاوقتے کہ (میرے جسم سے) ہستی کی آلائش کی گرد دُھل نہ جاتی اور میں ایک قطرے کی صورت دریا میں ضم نہ ہو جاتا۔ اس ارم آباد میں قدم رکھتے ہی بغیر کسی علاج کے اور بغیر کوئی دوا کھائے، نئے عوارض کی تکلیف جاتی رہی۔ بلکہ وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک حد تک اصل مرض میں بھی افاقہ ہوگیا۔ روزمرہ کے مرکبات میں سے جس قدر بھی فراہم ہو جاتے ہیں، وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر ہیں، ورنہ اب تو تلافیِ ماضی منظور ہے، نہ رعایت حال۔

بقیہ مکتوبات میں سے تین رباعیات، دو قطعات، ایک مسدس اور ایک قصیدے کا خصوصی طور پر ذکر کرنا مقصود ہے۔ خط نمبر ۵ رمیں شامل رباعیِ غالبؔ ملاحظہ ہو جس میں بنگال کی فضا کو خوبی سے قید کر لیا ہے ۔

ہر پردۂ زندگی نوائے دارد
ہر گوشۂ از دہر فضائے دارد

ہر چید یبوست از دماغم یکسر

بنگالہ شگرف آب وہوائے دارد

ترجمہ: (یہاں) ہر پردۂ زندگی میں ایک خاص لے ہے۔ اور زمانہ کے ہر گوشے کی (اپنی) فضا ہے۔ میرے دماغ سے خشکی کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ بنگال عجیب آب و ہوا رکھتا ہے۔

وہ خط نمبر ۱۳ / میں روداد کلکتہ کا ذکر کرتے ہوئے حاکم سے رسمِ ملاقات اور اُس کے دفتر پر طنز ملیح سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”---مختصر یہ کہ جب کارفرما چلا گیا، نذر کی رسم ختم ہوگئی۔ جس طرح اس بارگاہ میں سارے وکلا اور سارے اہل ہر سال میں تین بار، کہ دو عیدوں اور ایک بڑے دن سے عبارت ہیں... منصف مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ بہادر کی خدمت میں نذر پیش کیا کرتے تھے، جو اگرچہ قبول نہ کی جاتی تھی، لیکن ایک عمدہ رسم اور اچھی بات عمل میں نہ آئی --- غالبؔ آشفتہ نوا نے جب کام کا یہ ڈھنگ دیکھا تو ایک رباعی کہہ کر منصف مذکور کی خدمت میں گزرائی جس میں محبت کا شہد لپٹا ہوا تھا اور ممدوح کے مذاق کا یہی شیوہ ہے۔ کیا بتاؤں کہ اس فطرت سے شگفتگی کے کیسے (لطیف ریشے پنہاں) تھے کہ رباعی نے اس کی پیشانی کو چاند کی طرح تاباں کر دیا۔ ہونٹوں پر تبسم (لا کر) آنکھوں میں محبت (بھر کر) اور زبان وستائش سے تر کر کے اس نے کہا کہ ”زہے نذرِ مخلصانِ صادق... نہ منع ہی کرتے ہیں اور نہ ہی معاف“ اور وہ رباعی یہ ہے ؎

سرتا سرِ دہر باغ وبستانِ توباد

صدر نگ گلِ طرب بہ دامانِ تو باد

عید است وبہارِ خوش دلی ہا دارد

جان من وصد چو من بہ قربانِ توباد

ترجمہ: سارا زمانہ تیرا باغ و بستان بن جائے۔ تیرے دامن میں طرب کے سینکڑوں رنگ کے پھول ہوں۔ عید ہے اور اس میں خوش دلی کی بہاریں ہیں۔ میری اور مجھ جیسے سینکڑوں کی جانیں تجھ پر سے نچھاور ہو جائیں۔

غالبؔ خط نمبر ۳۶ ر میں اپنی ذہنی اُلجھنوں، پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے حکّام کی بدنظمی پر تلملاہٹ کا مظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کاش وہ ایران کی خوش گوار آب وہوا میں وہاں کے کسی بھی شہر میں پہنچا دیا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ بہارستان کا مقابلہ البلاد بنگالہ سے کرتے ہوئے ادبی فضا کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ منظر و پس منظر سے مکتوب الیہ بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔ رباعی ملاحظہ ہو ؎

غالبؔ چوزِ دامگہ بدرجستم من
آخر زچہ بودہ این چنیں برگشتن
باید کہ کنم ہزار نفریں برخویش
اما (بہ زبانِ) جادہ راہِ وطن

ترجمہ: غالبؔ جب میں جال سے نکل گیا تھا (تو) اس واپسی کا بھلا کیا سبب؟ مجھے چاہیے کہ میں خود پر ہزار نفرین کروں، لیکن جادۂ راہ وطن کی زبان سے۔

خط نمبر ۶ ر میں مسدس کے طرز پر روداد سفر کو چھ مصرعوں میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

از جگرِ تشنہ بہ دریا سرود
وزتن بے جان بہ مسیحا درود
از شبِ دیجور بہ نیر سلام
وزلبِ مخمور بہ صہبا پیام
از دل افگار بہ مرہم سپاس
وزمن رہ جوی بہ خضر التماس

ترجمہ: جگرِ تشنہ کی جانب سے دریا کے لیے نغمہ اور تنِ بے جاں کی جانب سے مسیحا کے لیے درود۔ اندھیری رات کی طرف سے آفتاب کو سلام اور لب خماریں سے صہبا کو پیام۔ زخمی دل کی جانب سے مرہم کا شکریہ اور مجھ متلاشیِ راہ کی طرف سے خضر (رہنما) کو عرض داشت۔

خط نمبر ۳۱ ر اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں انھوں نے رباعی کے ساتھ ساتھ قطعات سے بھی کام لیا ہے اور مکمل روداد کو نہایت موثر انداز میں پیش کر دیا ہے۔ مع ترجمے کے قطعات ملاحظہ ہوں ؎

چوں شد بہ صحنِ مدفنِ خانِ بزرگوار
طرح اِمام باڑۂ عالی سپہر سا

ترجمہ: جب صحنِ مدفن خان بزرگوار میں آسمان جیسے بلند امام بارے کی بنیاد رکھی گئی۔

رضوان زخلد نور برآں بام ودر فشاند
تاگشت خشت وسنگ چو آئینہ رونما

ترجمہ: رضوان نے جنت سے اس کے بام ودر پر نور چھڑکا، یہاں تک کہ اُس کے سنگِ وخشت آئینے کی طرح رُونما ہو گئے۔

رحمت پئے بساطِ در آں بزمِ تعزیت
آورد اطلسِ سیہ از سایۂ ہما

ترجمہ: رحمت اُس بزمِ تعزیت میں بساط کے لیے سایۂ ہما کی سیاہ اطلس لائی۔

رفتم نیاز مند بہ پیشِ سروشِ فیض
گفتم کہ پردہ از رُخ تاریخ برکشا

ترجمہ: میں نیاز مند سروشِ فیض کے سامنے گیا اور میں نے کہا کہ تاریخ کے چہرے سے پردہ ہٹا دے۔

در ''تعزیت سرائے'' بزد ''نالہ'' وبگفت

۸۶ ۱۱۵۸

این است ساز نغمۂ تاریخ این بنا

ترجمہ: نالہ نے ''تعزیت سرائے'' کے در پر دستک دی اور کہا اس بنیاد کے نغمۂ تاریخ کا ساز یہ ہے۔

جب لفظ (’نالہ‘ کے اعداد) ’تعزیت سرائے‘ کے اعداد (پر) بڑھائے جائیں تو ۱۲۴۴ ہو جائیں گے۔[۳] اُس مسجد کی تاریخ کا قطعہ کہ وہ بھی اسی امام باڑے کے صحن میں ہے:

قطعہ

صحنِ امام باڑہ ومسجد ہر آں کہ دید
در کربلا زیارتِ بیت الحرام کرد

ترجمہ: جس شخص نے بھی امام باڑے کے صحن اور مسجد کو دیکھا (گویا) اُس نے کربلا میں بیت الحرام کی زیارت کرلی۔

مفتیِ عقل از پئے تاریخ آں بنا
ایما بہ سوئے من زرہِ احترام کرد

ترجمہ: اس عمارت کی تاریخ کے لیے مفتی عقل نے احترام کے ساتھ میری طرف اشارہ کیا۔

گفتم بوے بدیہہ، ''خوشا خانۂ خدا''
شُد خشمگیں دمے کہ نظر در کلام کردؔ

ترجمہ: میں نے جب فی البدیہہ 'خوشا خانہ خدا' کہا تو وہ میرے کلام پر نظر ڈال کر ذرا (سی) دیر کے لیے ناراض ہوگیا۔

خاشاک رفت وپائے ادب در شکنجہ ریخت
ایہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد

ترجمہ: اس نے کوڑا کرکٹ صاف کردیا اور پائے ادب کو شکنجے میں ڈال دیا۔ ایہام کو خارج کر کے معنی پورے کردیے۔

غالبؔ نے قصیدہ میں بھی اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کو ملحوظ رکھا ہے۔ وقت کے تقاضوں اور نجی مجبوریوں نے فن سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ اُن کی انا پسندی میں مبالغہ آرائی اور جوش وخروش ضرور ہے مگر فن کہیں بھی مجروح نہیں ہونے پاتا ہے۔ غالبؔ، دیوان محمد علی کو لکھتے ہیں:

وہ قصیدہ جو جناب ناظم الملک مسٹر فرانس ہاکنس بہادر ہیبت جنگ کے خدام کی مدح میں اس نوکِ قلم سے تصنیف کیا گیا ہے، تحریر کیا جاتا ہے:

یافت آئینہ بختِ تو زدولت پرواز
جلوہ ہا ساز کن اے دہلی وبرخویش بناز

ترجمہ: تیری قسمت کے آئینے کو اقبال سے آرائش ملی ہے۔ اے دہلی اپنے جلوے کو روشن کر اور اپنے اوپر فخر کر۔

گل برافشاں بہ گریباں چو حریفِ سرمست
جلوہ گر شوبہ نظر ہمچو عروسِ طناز

ترجمہ: ایک دل برِ سرمست کی طرح گلے میں پھول ڈال اور ایک عروسِ طناز کی طرح نظر کے سامنے جلوہ گر ہو۔

وقت آنست کہ پائیز تو گردد نو روز
وقت آنست کز انجامِ تو بالد آغاز

ترجمہ: اب وہ وقت ہے کہ تیری خزاں نو روز میں بدل جائے۔ اب وہ وقت ہے کہ آغاز تیرے انجام سے پھوٹے۔

جوشِ آہنگِ ہزار است ترا بانگِ سرود
موجِ نیرنگِ بہار است ترا رشتۂ ساز

ترجمہ: تیرے لیے سرود کی آواز جوشِ آہنگ کی مثال ہے، (اسی طرح) تیرے لیے رشتۂ ساز موجِ نیرنگِ بہار کے مصداق ہے۔

سیر گاہے ست در اطراف تو، گوئی کشمیر
روستائی ست ز اقصایِ تو، گوئی شیراز

ترجمہ: کشمیر تو گویا تیرے مضافات کی ایک سیرگاہ کی طرح ہے اور شیراز تیرے دور افتادہ علاقوں کا ایک گاؤں ہے۔

گردِ سر گردہ است آں بقعہ کہ گردِ رہ تُست[5]
خاطر آویز تر از طرۂ مشکینِ ایاز

ترجمہ: اے (ممدوح کی) جائے قرار میں تیرے قربان ہو جاؤں کہ تیرے راستے کی گرد، ایاز کی زلفِ مشکیں سے زیادہ دل آویز ہے۔

چشمِ بد دور کہ ہر جادہ بہ صحرائے تو گشت
ہمچو گلدستۂ نقشِ قدمِ شاہدِ ناز

ترجمہ: چشمِ بد دور کہ تیرے صحرا میں ہر جادہ شاہدِ ناز کے نقشِ قدم کے گلدستے کی صورت ہو گیا ہے۔

فرصتت باد کہ آرائشِ ایوانِ توشُد
داورِ عادلِ ظالم کُشِ مظلوم نواز

ترجمہ: (اے دہلی) خدا تجھے سلامت رکھے کہ ایک (ایسا) منصف، جو عادل، ظالم کش اور مظلوم نواز ہے تیرے ایوان کی زینت بن گیا۔

.........برخیال چمن کوئے او[٦]
بستہ بر دامنِ نظارہ ز فردوس (طراز)

ترجمہ: جس کے کوچے کے چمن کے خیال نے دامنِ نظارہ پر جنت سجادی ہے۔

آں کہ برخاکِ درش چرخ پے عرضِ سجود
شب و روز از مہ وخورشید بود ناصیہ ساز

ترجمہ: وہ جس کے دروازے کی خاک پر آسمان تقدیمِ سجدہ کے لیے رات دن چاند اور سورج کے ذریعے پیشانی بن جاتا ہے۔

آں کہ در ہند بہ یُمنِ اثرِ معدلتش
آشیاں ساختہ کنجشک ز سرپنجۂ باز

ترجمہ: وہ کہ ہندوستان میں اس کی انصاف پسندی کی برکت سے چڑیا نے باز کے پنجے سے اپنا گھونسلا بنایا ہے۔

آں کہ باشد بہ رہِ فیض درِ فکر متش
چوں درِ آئینہ پیوستہ بہ روئے ہمہ باز

ترجمہ: وہ کہ فیض رسانی کی خاطر اس کی بخشش کا دروازہ ہمیشہ اور ہر ایک کے لیے درِ آئینہ کی طرح کھلا رہتا ہے۔

بہ سلامش نہ خمیدہ است ز صد جا گر چرخ
از چہ شد دائرہ بر دائرہ مانندِ پیاز

ترجمہ: اگر آسمان سوجگہ سے اُس کے سلام کے لیے نہیں جھکا تو پیاز کی مانند دائرے پر دائرہ کیوں ہو گیا ہے؟

نمِ یک رشحۂ فیض است کہ تاریخت فرد
در دِلش رائے شد و برلبِ عیسیٰ اعجاز

ترجمہ: اُس کے رشحہ فیض کی نمی ہے کہ جب ٹپکی تو اس کے دل میں رائے ہوگئی اور عیسیٰ کے لب پر معجزہ۔

استوایافت زمانش بہ زمیں بسکہ زِ عدل
سایہ بر شخص نہ چربید بہ پہنا و دراز

ترجمہ: اس کے عہد میں زمین نے انتہائے عدل سے ایسی برابری حاصل کر لی ہے کہ کسی شخص پر سایہ نہ چوڑائی میں اور نہ (ہی) لمبائی میں غالب ہوا۔

بسکہ دل گشت ز فیضِ اثرِ تر بیتش
شیشہ را نیست بہ ہنگامِ شکستن آواز

ترجمہ: اس کی تربیت کی اثر کے فیض (کی انتہا) سے (شیشہ) دل ہو گیا، (چنانچہ اب) شیشے کے ٹوٹنے کے وقت آواز نہیں ہوتی۔

عزمِ وے در روشِ عربدہ با چرخِ سہیم
رائے وے در اثرِ جلوہ بہ خورشید انباز

ترجمہ: اس کا ارادہ جنگ کے معاملے میں آسمان کا شریک ہے اور اس کی رائے اثرِ جلوہ میں سورج کی ساجھی ہے۔

بر رُخ از تابِ رخش فرِ سعادت پیدا
در رہ از گردِ رہش خیلِ ہما در پرواز

ترجمہ: چہرے پر، اس کے چہرے کی تابنا کی سے، سعادت کی شان آشکارا ہے (اور) اس کے راستے کی گرد سے راستے میں (گویا) ہماؤں کی ڈار اڑ رہی ہے۔

اے کہ بر نامۂ نامِ تو ز دیوانِ قضا
بستہ انداز اثرِ دولتِ جاوید طراز

ترجمہ: اے وہ ذات، کہ تیرے نام کے خط پر دیوانِ قضا سے دولت جاوید کے اثر کے نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔

ایں رقم ہا کہ فرو ریختہ ام از رگِ کلک
باشد آرائشِ تقریب پئے عرضِ نیاز

ترجمہ: یہ ساری تحریر، جو میں نے نوکِ قلم سے لکھی ہے، کیا (ہی) اچھا ہوا گر عرضِ نیاز کی تقریب کی زینت بن جائے۔

ورنہ اندازۂ ہر بے سروپائے نہ بود
کہ بہ اندازِ ثنائے تو نماید تگ وتاز

ترجمہ: ورنہ ہر بے سروپا آدمی میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ تیری تعریف کے اظہار میں تگ ودو کرے۔

بندہ ام لیک دریں مرحلہ مہمانِ توام
کردہ ام طے بہ امیدِ تو رہ دور و دراز

ترجمہ: (یوں تو) میں ایک غلام ہوں، تاہم اس مرحلے پر میں تیرا مہمان، تیری (ہی) امید پر میں نے دوردراز کا (یہ) راستہ طے کیا ہے۔

گر نہ آوازۂ عدلت شدے آہنگِ حُدی
ناقۂ من زرہِ سعی نہ گردیدے باز

ترجمہ: اگر تیرے عدل کی شہرت حُدی کی آواز نہ بن جاتی تو میرا ناقہ سعی کے راستے سے واپس نہ ہوتا۔

نالۂ زارِ من از شدّتِ جورِ شرکاست
نہ زِ دیوانگی وخیرگی وشوخی وآز

ترجمہ: میرا نالۂ زار شرکا کے ظلم کی وجہ سے ہے (یہ) دیوانگی، حماقت، شوخی اور حرص کی وجہ سے نہیں۔

بر رُخِ من درِ رزقے کہ کشاید داور
حیف باشد کہ کند خصمِ بداندیش فراز

ترجمہ: اُس دررزق کو، جو داور میرے اوپر کھولتا ہے، افسوس کی بات ہے اگر بداندیش دشمن بند کردے۔

بست سال است کہ با یک دگر آویختہ ایم
من وغاصب چو سرِ رشتۂ شمع ودمِ گاز

ترجمہ: بیس سال سے میں اور غاصب ایک دوسرے سے (یوں) دست وگریباں ہیں جس طرح شمع کی بتی اور قینچی۔

او ز خونخوار گیِ خویش در اندازِ غضب
من زبے چارگیِ خویش در آدابِ نیاز

ترجمہ: وہ اپنی خونخواری کی وجہ سے غضب ناک ہے اور میں اپنی بے بسی کی وجہ سے حالتِ نیازمندی میں ہوں۔

آہ از عربدہ پردازیِ بختِ سرکش
داد از خانہ براندازیِ چرخِ کج باز

ترجمہ: (اپنے) سرکش بخت کی عربدہ جوئی پر (مجھے) افسوس (ہوتا ہے، اور میں) آسمانِ کج باز کی خانہ براندازی سے انصاف (مانگتا ہوں)۔

باندہ کے منظر و پس منظر میں دوسرا حصّہ اُن کے اردو کلام سے متعلق ہے۔ میں یہاں صرف اُن اردو غزلوں کا ذکر کروں گا جن پر بیشتر محققین متفق ہیں کہ یہ غزلیں قیامِ باندہ یا پھر سفرِ باندہ کی دین ہیں۔ پہلی غزل ؎

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہوکر اُڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہوگئے ہیں جمع، اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے، اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم، اندھیر ہے
پنبہ، نورِ صبح سے کم، جس کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں
زخم سِلوانے سے، مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سُوزن میں نہیں
بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوے
جلوۂ گُل کے سِوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں
قطرہ قطرہ، اک ہیولیٰ ہے ، نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت، قلزم آشامی مری
موجِ مَے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
ہوفشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود!
قد کے جُھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا غالبؔ! کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلّف ، ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

یہ دوسری غزل بھی باندہ پہنچتے ہی غالبؔ نے لکھی تھی ۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گُلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر یک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ ترے جلوے نے
کرے، جو پرتوِ خورشید، عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولٰی برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار، اب کھودنے پر گھاس کے، ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں، گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ ، گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سبب کیا ، خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا؟
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا!
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

تیرہ اشعار کی ایک اور معروف غزل باندہ کی رہینِ منت ہے ۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم وگوش ہے
مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق! یاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے
گوہر کو عِقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا!
کیا اوج پرستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار، اگر تمہیں ہوسِ نائے ونوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو، جوگوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہ زنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گُل فروش ہے
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں
نے وہ سُرور و سُور، نہ جوش وخروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے، یہ مضامیں، خیال میں
غالبؔ ، صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے

اس غزل کے تعلق سے جس کا مطلع ہے ؂

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی، آسماں کے لیے

روایت مشہور ہے کہ یہ غزل قیامِ باندہ کے دوران لکھنی شروع ہوئی تھی لیکن غالبؔ نے اس طویل غزل کو بعد میں مکمل کیا۔ البتہ غالبؔ کی وہ غزل جس کا ذکر بہت ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ درج ذیل غزل نہ تو دیوان محمد علی کی حیات میں لکھی گئی اور نہ ہی نواب باندہ کی زندگی میں بلکہ ذوالفقار علی کی وفات کے بعد ۱۸۴۹ء میں نواب علی بہادر علی کے مسند نشین ہونے کے بعد قلم بند کی گئی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو ؂

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو، تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ ”جاؤں کدھر کو میں“؟
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش ! جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
ہے کیا جو کس کے باندھیے؟ میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ ”یہ بے ننگ و نام ہے“
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو ، احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں؟
پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کررہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں
غالبؔ! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

اِس غزل کو غالبؔ کے خط بنام نواب علی بہادر مسند نشین باندہ (کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالبؔ، ص۲۹۱-۲۹۲) کے ساتھ پڑھیں تو دو دہائی کے وقفے کی حقیقت عیاں ہوگی۔ اِس کا بھی علم ہوگا کہ محل میں غالبؔ کا ذکر مسلسل ہوتا رہا ہوگا تبھی علی بہادرؔ علی جن کی عمر مسند نشینی کے وقت سترہ ۱۷ برس تھی، غالبؔ کی خدمت میں تحائف کے ساتھ اپنا کلام بھی بہ غرض اصلاح روانہ کرتے ہیں۔
جواب میں

(i) وقفے کی معذرت اور اپنائیت کا مظاہرہ ہے۔
(ii) غالبؔ تصحیح کرتے ہوئے نوعمر نواب کے کلام کی تعریف کرتے ہیں۔
(iii) اصلاح کے ساتھ شاعری کے رموز سے بھی واقف کراتے ہیں۔
(iv) فرمائش کو ملحوظ رکھتے ہوئے ''پنج آہنگ'' کا ایک نسخہ اور اردو کے کچھ اشعار سے نوازتے ہیں۔

○○○

حواشی

۱۔ جن اشعار کے ترجمے اِس مضمون میں نقل کیے گئے ہیں وہ پرتوؔ روہیلہ کی کتاب ''کلیاتِ مکتوباتِ فارسیِ غالبؔ'' مطبوعہ ۲۰۱۰ء سے ماخوذ ہیں۔

۲۔ لطیف الزماں خاں نے ''مکتوباتِ غالب'' میں کلّیات غالبؔ فارسی لکھنؤ، جنوری ۱۸۷۲ء، ص ۸۴ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کاتب کی غلطی سے سروش لکھ دیا گیا ہے۔ یہ لفظ سروش نہیں سوادش ہے۔

۳۔ پرتوؔ روہیلہ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

یہاں جو عبارت ہے (چون عددلفظِ ''تعزیت سرای'' بفزایند ۱۲۴۴ می شود) اس سے بات الجھ جاتی ہے اور مطلوبہ عدد حاصل نہیں ہوتا۔ یہ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے۔ غالباً اصل عبارت یوں ہوگی۔ چوں عددِ لفظ 'نالہ' بر عددِ لفظ ''تعزیت سرای'' بفزایند ۱۲۴۴ می شود۔ چوں کہ ''تعزیت سرای'' کے اعداد ۱۱۵۸ پر جب 'نالہ' کے اعداد ۸۶ بڑھائے جائیں تو حاصل جمع ۱۲۴۴ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ترجمہ اسی طرح کیا گیا ہے۔

۴۔ جب ''خوشا خانۂ خدا'' کے اعداد سے لفظ ''خاشاک'' کے عدد نکال دیں تو ۱۲۴۶ نکلتے ہیں اور جب دو عدد ''ادب'' کی ''ب'' کے، کہ ''ریختنِ پائے ادب'' سے اس کا اشارہ ملتا ہے، (نکال دیں تو ۱۲۴۴ رہ جاتے ہیں اور یہی (عدد) چاہیے تھا۔ عزیزوں کو واجبات پہنچیں۔

۵۔ کلیات غالبؔ فارسی مرتبہ سید مرتضیٰ حسین لکھنوی، جلد دوم، ص ۱۲۰ ر پر یہ مصرع اس طرح ہے:

گرد سر گردمت اے بقعہ کہ گرد رہِ تست   ترجمہ بھی اسی طرح کیا گیا ہے۔

۶۔ چوں کہ یہ قصیدہ اصل میں فرانس ہاکنس ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور بعد میں ہاکنس کی غالبؔ کے خلاف رپورٹ کے سبب چارلس مٹکاف کو پیش کر دیا گیا، شعر میں تبدیلی کر دی گئی ہے اور پہلے مصرعے کے کچھ الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ صرف

باقی ماندہ الفاظ کا ترجمہ ہی پیش کیا گیا ہے۔کلیات غالبؔ فارسی مرتبہ سید مرتضیٰ حسین لکھنوی جلد دوم ص ۱۲۱؍ پر یہ شعر اس طرح درج ہے:

چارلس مٹکفِ فرخندہ شمائل کہ بہ دہر

بَستہ بر دامنِ نظارہ زفردوس جمال (مترجم)

لطیف الزماں خاں ''مکتوباتِ غالبؔ'' کے صفحہ نمبر ۱۵۶ میں لکھتے ہیں: کہ پہلے مصرعے میں یہ الفاظ ہی نہیں ہیں اور نہ سید اکبر علی ترمذی نے غائب الفاظ کو کلیاتِ غالب مرتبہ امیر حسن نورانی سے پُر کیا ہے۔صحیح مصرعہ اس طرح ہے:

چارلس مٹکف فرخندہ شمائل کہ بہ دہر

کلیاتِ غالبؔ فارسی لکھنؤ، ۱۸۷۲ء، ص:۲۷۳

○○○

یادوں کی بازیافت: باندہ، غالبؔ اور متعلقین

گھر میں قصہ کہانی سُننے سُنانے کا ماحول تھا۔ اردو کے اخبار ورسائل پابندی سے آتے تھے جو پڑھے اور سُنائے جاتے تھے۔ اس ماحول میں، میں نے غالبؔ کے تعلق سے بھی کہانیاں سُنیں جن کا مرکز ومحور باندہ ہوا کرتا تھا۔ ایسا اس لیے کہ تقسیمِ ہند سے قبل میرے ایک بُزرگ سید محمد افراہیم شاہ مویشیوں کے ڈاکٹر (Veterinary doctor) کی حیثیت سے باندہ میں تعینات تھے۔ دادی صاحبہ (زوجۂ ڈاکٹر سید محمد افراہیم شاہ) جن کا مائیکہ فتح پور ہسوا تھا، وہ اناؤ (سسرال) سے باندہ کے سفر کو بڑے دلچسپ واقعات کے ساتھ بیان کرتیں۔ خاص طور سے موضع چلّہ تارہ کے پاس دریائے جمنا اور دریائے کین کے اتصال پر بنے پیپے/ ناؤ کے پُل سے گزرنے کا ذکر وہ ہر بار کچھ اس حیران کُن انداز میں کرتیں کہ سند بادی کہانیاں یاد آجاتیں۔ جب کبھی ہم لوگ اُن سے دریافت کرتے کہ سمندر جیسے پاٹ کو جہاں چاروں طرف پانی ہی پانی ہو، آپ پیپے یا ناؤ سے بنے پُل سے گزرتے ہوئے گھبراتی نہیں تھیں؟ تو دادی صاحبہ فرماتیں سوچو غالبؔ نے سوسوا سوسال پہلے اس کو کس طرح پار کیا ہوگا؟

۱۹۷۵ء میں اناؤ[1] سے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ رہائش آفتاب ہال کے ممتاز ہوسٹل میں تھی۔ کہانیاں لکھنے کا شوق تھا جن پر اصلاح پدم شری قاضی عبدالستار صاحب کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ میں اُن کے عزیز ترین شاگردوں میں شامل ہوگیا۔ ۱۹۸۱ء کی بات ہے میں ایم۔اے۔ کرچکا تھا۔ پی ایچ.ڈی. میں داخلے کے مراحل مکمل ہورہے تھے۔ اُس زمانے میں قاضی صاحب انوپ شہر روڈ پر سلیمان ہال کے صدر دروازے کے سامنے یونیورسٹی کے مکان کے اوپری حصہ میں رہتے تھے۔ نیچے سنگھ صاحب کا کتاب گھر تھا۔

معمول کے مطابق شام کو ہوسٹل سے نکل کر آفتاب منزل میں نعیم صاحب یا نسیم قریشی صاحب کی خیریت دریافت کرتا، یا پھر آگے بڑھ کر قاضی صاحب کے یہاں حاضری دیتا۔ اُس دن میں براہ راست قاضی صاحب کے گھر پر حاضر ہوا۔ حسب معمول چائے کے بجائے قاضی صاحب نے کہا نیچے ایک رکشہ لے لو، سیما ٹاکیز چلنا ہے۔ رکشہ کو روک کر میں اوپر پہنچا۔ قاضی صاحب تیار تھے۔ اُس رکشہ سے ہم دونوں سیما ٹاکیز پہنچ گئے فلم تھی 'غالبؔ'۔

قاضی صاحب نے اپنے احباب سے سہراب مودی کی ہدایت کاری اور راجندر سنگھ بیدی کے مکالموں کی تعریف کی لیکن سعادت حسن منٹو کی کہانی سے وہ بہت مطمئن نہیں محسوس ہوتے تھے۔ اُستاذ مکرم نے ایک سال کی چھٹی لے رکھی تھی اور واقعی ایک سال بعد اُن کے ناول غالبؔ کا خاکہ اُن کے ذہن میں ترتیب پا چکا تھا[1]۔ مجھ سے وہ برابر باندہ کا حدود اربعہ اور راستوں کا جغرافیہ دریافت کرتے رہتے تھے لیکن ناول میں غالبؔ کے قیام باندہ کے تعلق سے کوئی اہم ذکر نہیں کیا تھا۔ یہ اُن کی تخلیق میں پیوست نہیں ہو رہا تھا۔ انھوں نے فضا، ماحول، منظر اور پس منظر کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھا تھا جس میں ترک بیگم کو مرکزیت ملتی ہے۔ لیکن ان کی اچانک موت کے بعد چغتائی بیگم اور مغل جان کے رنگا رنگ پہلو اُبھرتے ہیں تاہم عہد غالبؔ کے ساتھ ان کی خانگی زندگی مکمل طور سے جلوہ گر ہے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں بھوپال اور فتح پور کے عزیز اناؤ ضرور آتے۔ ہمارا مکان بالائے قلعہ تھا۔ تاریخی قلعہ کے تمام نقوش عرصہ ہوا مٹ چکے ہیں۔ زیرِ قلعہ آبادی کا طویل سلسلہ ہے۔ ملحق محلوں میں شیخ واڑہ، چودھرانہ، گدیانہ، زیر ڈھس، زیر کھڑکی، قیصر گنج وغیرہ ہیں۔ قلعہ کا اُوپری حصہ بہت بڑے میدان کی شکل میں تھا، جس میں اب بھی ہفتہ میں دو[2] دن، اتوار اور بدھ کو بازار لگتا ہے۔ بقیہ دنوں یہ میدان خالی رہتا اور ہم سب کے کھیلنے کے لیے معقول جگہ قرار پاتی۔ تعطیلات کا اعلان ہوتے ہی میں بھی گھر پہنچ جاتا وہاں میرے خالو اشتیاق عارف[3] صاحب بھی اپنے بچوں کے ساتھ ضرور آتے۔ مقتدر سیاسی رہنما مولانا شوکت علی کے نجی معتمد کی حیثیت سے اُن میں تاریخ اور آثارِ قدیمہ سے بھی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ وہ اکثر باندہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ غالبؔ کے بارے میں بتاتے بلکہ بندیل کھنڈ پر بھی روشنی ڈالتے تھے۔

۱۹۹۰ء کی بات ہے۔ گرمیوں کی تعطیل میں، میں اناؤ گیا ہوا تھا۔ رشتہ دار آئے ہوئے تھے۔ دوپہر میں خوش گپیوں کے دوران میری دادی نے اعلان کر دیا کہ میں نے صغیر کی شادی باندہ

میں طے کر دی ہے۔ سبھی ہکّا بکّا تھے۔ اچھے خالو نے کہا میرے بھوپال جانے سے پہلے تاریخ ضرور بتا دیجیے گا تا کہ اُسی اعتبار سے پروگرام بنایا جائے۔ ۹/اگست ۱۹۹۰ء کو سید امیر حسن شاہ کی نواسی، مولانا عبیدالرحمٰن حسنی کی بیٹی سیما بیگم سے میری شادی ہوگئی۔ سال میں دوبار باندہ جانا ہوتا تو ''محسن منشن'' میں ادبی شخصیات خصوصاً احسان آوارہ[۵] سے گاہے بگاہے ملاقات ہوتی، گھوم پھر کر غالبؔ اور باندہ کا ذکر موضوع بحث رہتا۔ قتیلؔ باندوی کے بیٹے اور ڈاکٹر شبانہ رفیق کے علاوہ بزرگوں میں شیو پرشاد برگ، ڈاکٹر وہاج الدین، معین راہیؔ وغیرہ، طلبہ میں ریشما خاتون اور صالحہ بیگم بھی اپنے سوالنامے تیار رکھتی تھیں۔ بعد میں ان دونوں خاتون نے پروفیسر ابوالحسنات حقی کی نگرانی میں کانپور یونیورسٹی سے بندیل کھنڈ کے تعلق سے پی ایچ.ڈی.کی ڈگریاں حاصل کیں۔

(ii)

۲۰۰۲ء-۲۰۰۳ء میں پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر مختار الدین احمد آرزوؔ کی سرپرستی میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ''خطوطِ غالبؔ'' پروجیکٹ پر کام کا آغاز ہوتا ہے۔ ظفر احمد صدیقی صاحب پروفیسر نذیر احمد کے معاون کی حیثیت سے کام دیکھ رہے تھے اور یہ خاکسار پروفیسر مختار الدین کے زیر سایہ کچھ سیکھنے کا جتن کر رہا تھا۔ آرزوؔ صاحب کو علم تھا کہ میری سسرال باندہ ہے، اور میرے خُسر سید عبیدالرحمٰن حسنی مرحوم نے جن کا آبائی وطن لکھنؤ تھا، ثانوی وطن کلکتہ (ہُوگلی) کو بنالیا۔ وہ تا حیات کلکتہ سے باندہ، باندہ سے لکھنؤ اور پھر اسی راستے سے واپس ہوتے رہے۔ لہٰذا پروفیسر مختار الدین آرزو نہایت مشفقانہ انداز میں باندہ اور غالبؔ کے تعلق سے اکثر غور وفکر پر اُکساتے رہتے۔

بی.اے. میں داخلہ لینے کے بعد جن اساتذہ سے رفتہ رفتہ بے حد قریبی تعلقات ہوگئے اُن میں پدم شری قاضی عبدالستار کے بعد ڈاکٹر محمد انصاراللہ نظر تھے۔[۶] اُستاذ مکرم پروفیسر انصاراللہ سے بھی اِس موضوع پر گفتگو ہوتی جو اُس وقت نساخ[۷] کے تذکرہ ''سخن شعرا'' پر کام کر رہے تھے، اور میرے گھرانے سے بخوبی واقف تھے، اِس کا ذکر ''افسانوی ادب کی نئی قرأت'' (مطبوعہ ۲۰۱۱ء) کے مقدمے میں درج ہے۔ یہ طویل تمہید اس وجہ سے کہ باندہ اور غالبؔ سے ایک پُرانا رشتہ ہے۔ ان گنت یادیں نہ صرف ذہن میں بلکہ صفحۂ قرطاس پر محفوظ تھیں بس ان کی ترتیب و تنظیم کی نوبت نہیں آنے پا رہی تھی۔ جولائی ۲۰۱۸ء میں ملازمت سے سبک دوشی کے بعد یکسوئی سے ازسرِ نو مطالعہ کیا تو احساس ہوا کہ مجھے غالبؔ اور باندہ کے تعلق سے بہت کچھ رقم کرنے کی ضرورت ہے۔

حواشی

۱؎ اناؤ، اجودھیا کا سرحدی علاقہ اور صوبۂ اودھ کا مردم خیز خطہ رہا ہے۔ آج بھی یہ شہر اپنے دامن میں درجنوں کارخانوں کو سمیٹے ہوئے کاشت کے اعتبار سے نہایت زرخیز ہے۔ اس کے ایک جانب ملک کی بڑی ندی گنگا ہے تو دوسری طرف سئی ندی۔ چھوٹی چھوٹی نہریں، بڑے بڑے تالاب اور جھیل نے اناؤ کے حُسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ روایت ہے کہ شری رام چندر جی بن باس جاتے ہوئے یہاں ٹھہرے تھے اور طرح طرح کے پرندوں کے اس بسیرے کو انھوں نے بہت پسند کیا تھا۔ لکھنؤ، ہردوئی، کانپور، فتح پور اور رائے بریلی کے مابین بسا ہوا یہ شہر اپنے قصبات کی وجہ سے بھی بے حد مشہور ہے۔ مثلاً گنج مراد آباد، نیوتنی، موہان، آسیون، صفی پور وغیرہ۔ یہ اضلاع شروع سے عربی اور فارسی کا گہوارہ کہلائے ہیں تو بانگرمئو، پُروا، موراواں سنسکرت اور ہندی کا مرکز ہیں اور حسن گنج، بدرکا، ہڑہا وغیرہ انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونجتے رہے ہیں۔

تاریخ کے اوراق کو پلٹ کر دیکھیں تو علم و ادب کے نور سے جگمگاتا ہوا یہ شہر اپنے قصبات کی وجہ سے بھی بے حد مشہور رہا ہے۔ جیسے دریائے سئی کے کنارے، ملیح آباد، حسن گنج اور نیوتنی سے ملی ہوئی خوشگوار بستی کا نام ہے موہان، جو علم و فضل کے لحاظ سے ''موہان از خطۂ یونان'' کہلایا ہے۔ یہاں دیکھیں تو جسٹس سید امیر علی موہانی، بیخود موہانی، افقر موہانی، بسملؔ موہانی، حسرتؔ موہانی، عفت موہانی جیسے کئی نام ادبی اُفق پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح گنج مراد آباد سے ملی ہوئی صوفیوں کی بستی صفی پور ہے جہاں کے شاہ عزیز صفی پوری، اقبالؔ صفی پوری، شہید عارف اور رونق صفی پوری نے بے حد شہرت حاصل کی ہے۔ نیوتنی، مسعود حسن رضوی ادیب اور آسی نیوتنی پر ناز کرتی ہے۔ صبورؔ، سروشؔ، یعقوبؔ، ظفرؔ، جلیلؔ، اثرؔ، چراغ محمد اور عذرا پروین جیسے درجنوں نام گنائے جا سکتے ہیں جو راقم الحروف کے آبائی وطن کی عظمت

کے گیت گاتے ہیں۔ مجاہدین آزادی کی فہرست بھی طویل ہے جن میں چندر شیکھر آزاد اور حسرتؔ موہانی کے علاوہ رام بخش، چندریکا بخش، بھگوتی پرشاد مادھو، حبیب الرحمٰن انصاری، وشمبھر ناتھ ترپاٹھی، اوما شنکر دیکشت وغیرہ شامل ہیں۔
قومی یکجہتی کے جذبہ سے معمور شہر اناؤ ہندی جگت میں بھی اپنی شان برقرار رکھے ہوئے ہے۔ سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، بھگوتی چرن ورما، رام ولاس شرما، شیو منگل سنگھ سُمن، جگدمبیکا پرساد ہتیشی، رمئی کاکا، پرتاپ نرائن مشرا، بھوپیندر ناتھ شکلا، رائے بھوانی بخش، نند دُلارے باجپئی، نصیر احمد نصیر وغیرہ چند اہم نام ہیں جن کا آبائی وطن اناؤ ہے۔ ہمارے اس شہر کے تعلق سے یہ روایت بھی مشہور ہے کہ راجا اُنونت راؤ نے اس شہر کو سجانے سنوارنے میں بڑی دلچسپی دکھلائی تھی۔ اُن کا بنوایا ہوا بے حد پائیدار قلعہ سید سالار مسعود غازی کے ذریعے مسلمانوں کے تسلط میں آیا اور کچھ عرصے بعد بالائے قلعہ شاہی مسجد تعمیر ہوئی۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ صدیوں بعد اس شاہی مسجد سے ملحق صحن میں قائم مکتب سے جگت موہن لال رواںؔ کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا تھا۔

۲۔ ۲۶۰ رصفحات پر مشتمل یہ ناول ۱۹۸۶ء میں ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے شائع ہوا۔

۳۔ اپنے عہد کے بے مثل صحافی، بلند پایہ ادیب اور صاحبِ طرز انشاء پرداز تھے، اردو صحافت خصوصاً مدھیہ پردیش کی صحافت میں انھوں نے ایک طرح کا نوعی انقلاب برپا کیا۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۲۲ء کو قصبہ ہسوہ ضلع فتح پور میں پیدا ہوئے۔ والد الطاف حسین فارسٹ آفیسر تھے، جنھوں نے آخری وقت میں بھوپال میں سکونت اختیار کی۔ ’خلافت‘، ’ندیم‘، ’افکار‘، ’قائد‘، ’آفتابِ جدید‘، ’الحمراء‘، ’مزدور‘، ’افشاں‘، ’نیا ساتھی‘ جیسے اہم اخبارات ورسائل میں اشتیاق عارف کی تحریریں تقسیمِ ہند کے بعد کی ملکی اور غیر ملکی صورتِ حال کی ترجمان ہونے کے علاوہ ان کی صلاحیت اور صحافتی استعداد کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۰ء تک ”بھاسکر“ گروپ کے ایڈیٹوریل میں بھی شامل

رہے۔ ۲۰/ اکتوبر ۲۰۰۹ء میں اُن کا بھوپال میں انتقال ہوا۔

۴؎ سیما کے نانا سید امیر حسن شاہ کا آبائی وطن نیوتنی ضلع اناؤ تھا۔ اُن کے بزرگ فجی شاہ کے نام سے مشہور ہیں۔ سیما کے بڑے نانا سید محمد مختار کو نواب علی بہادر ثانی علّی کے عہد میں کروی اور گوئیرا مغل کی جاگیر ملی۔ انھوں نے اپنی رہائش کروی میں اختیار کی۔ لیکن اُن کے بیٹے سید محمد محسن جو باندہ میں اعزازی بیرسٹر تھے، سہولت کے پیش نظر شہر باندہ میں ڈگّی چوراہے کے ایک جانب کوٹھی خرید کر، قیام پذیر ہوگئے تھے۔ بعد میں اُن کے بڑے بیٹے سید شمیم محسن نے وہیں حاجی گنج بازار، اور رہائش کے لیے مُحسن منشن تعمیر کروایا۔ اِسی زمانے میں سیما کی والدہ اپنے بچپن میں ہی باندہ آگئیں۔ رفتہ رفتہ گھر کے دیگر افراد بھی آبائی وطن کو چھوڑ کر باندہ میں آباد ہوگئے۔ سیما کی والدہ اور پھر اُن کے تمام بچوں کی تعلیم وتربیت یہیں 'محسن منشن' (باندہ) میں ہوئی۔

سیما کے بزرگوں کے مراسم دیوان محمد علی کے خاندان سے استوار رہے ہیں اور آج بھی دونوں گھرانوں میں قربت ہے۔

سیما کے والد مولانا سید عبید الرحمٰن حسنی، فرنگی محل اور لکھنؤ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل، عالم اور مقرر تھے۔ اُن کے بڑے بھائی قاری عبدالولی ۱۹۰۵ء میں ملازمت کے سلسلہ میں ہوگلی، کلکتہ چلے گئے۔ شادی کے بعد عبید الرحمٰن صاحب نے مطب اور مدرسہ کے ساتھ ساتھ دلھوزی جامع مسجد (ہوگلی، کلکتہ) کی امامت بھی سنبھالی۔ اُسی کے صحن میں آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔

۵؎ احسان الحق قریشی ادبی حلقہ میں احسان آوارہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۲۶/ مارچ ۱۹۳۰ء کو باندہ میں پیدا ہوئے۔ انٹرمیڈیت اور ادیب کامل کرنے کے بعد ڈاک گھر کی سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ شاعری کے علاوہ تحقیق وتنقید سے بھی رغبت تھی۔ کئی روسی کہانیوں کے ترجمے کیے، جس پر ۱۹۸۶ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا۔ اردو میں سات اور ہندی میں تین کتابیں شائع ہوئیں۔ ہیڈ پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے ملازمت سے سبک دوشی کے بعد باندہ اور غالبؔ کے تعلق سے تحقیقی سرگرمیاں جاری

تھیں۔ طویل علالت کے بعد ۱۷/اکتوبر ۲۰۰۸ء میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

۶۔ غالبؔ پر تیار کی ہوئی اُن کی کتابیات ادبی حلقہ میں بے حد پسند کی گئی تھی۔ مزید اضافے کی غرض سے وہ بہت سی مستند دستاویز یکجا کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں کئی چیزیں خاکسار نے اُنھیں باندہ سے لاکر دی تھیں۔

۷۔ عبدالغفور نساخؔ، نواب عبداللطیف کے چھوٹے بھائی تھے۔ عبداللطیف نے جدید تعلیم پر توجہ دیتے ہوئے اینگلو پرشین، کلاسیز کا آغاز کیا، پریسیڈنٹی کالج کھلوایا، مجلس مذاکرہ اسلامیہ کی داغ بیل ڈالی۔ اپریل ۱۸۶۳ء میں محمڈن لٹریری سوسائٹی کے تحت سرسید احمد خاں کو ''ترغیبِ تعلیم انگریزی' کے عنوان سے فارسی میں تقریر کی دعوت دی۔ نساخؔ اپنے بھائی نواب عبداللطیف کی طرح مجسٹریٹ ہوئے۔ فروری ۱۸۶۴ء میں مغل شہزادے مرزا ہمایوں بخت کی بیٹی سے اُن کی شادی ہوئی۔ شادی سے ایک سال قبل ۱۸۴/صفحات پر مشتمل امپیریل سائز کا دیوان ''دفترِ بے مثال'' مظہر العجائب پریس کلکتہ سے شائع ہو چکا تھا۔ انھوں نے یہ دیوان غالبؔ کو تحفتاً بھیجا جس کے جواب میں غالبؔ نے ان کو تعریفی خط لکھا جسے نساخؔ اپنے لیے سند سمجھتے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں جب پہلی بار تپ دق کا علاج کرانے کے لیے دہلی گئے تو غالبؔ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن کے مشورے سے باندے کے حکیم کو دکھاتے ہوئے واپس آئے۔ جلد ہی ڈپٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے اُن کا بھاگل پور سے چھپرا تبادلہ ہو گیا۔ تعینات ہوئے ایک ماہ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ اطلاع ملی کہ ۱۵/فروری (۱۸۶۹ء) کو غالبؔ کا انتقال ہو گیا۔ نساخؔ اس سانحہ سے اور بھی ٹوٹ گئے۔ سرکاری کام کے بوجھ نے اُنھیں نڈھال کر دیا۔ لہٰذا چھٹی منظور ہونے پر جنوری ۱۸۷۰ء میں بغرض علاج دہلی روانہ ہوئے۔ غالبؔ کی سونی پڑی ڈیوڑھی کے دیدار کیے اور اُن کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے باندہ گئے۔ وہاں کی افراتفری اور خستہ حالی کو دیکھا۔

○○○

نواب ذوالفقار علی بہادر

پیدائش ۱۸۰۰ء۔ وفات ۱۸۴۹ء

دورِ نوابی ۱۸۲۳ء سے ۱۸۴۹ء (۲۶ برس)

غالبؔ ۲ر جولائی ۱۸۲۷ء کی رات باندہ میں داخل ہوئے

اگلے دن

دیوان محمد علی کے ہمراہ نواب ذوالفقار علی بہادر سے ملاقات کی۔

سید اکبر علی ترمذی کی غالبؔ پسندی

(۸؍جون ۱۹۲۴ء۔ ۲۳؍نومبر ۲۰۰۳ء)

ممتاز مؤرخ اور معروف آرکایولوجسٹ پروفیسر سید اکبر علی ترمذی ۸؍جون ۱۹۲۴ء کو ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں بمبئی یونیورسٹی سے فارسی، اردو اور انگریزی کے ساتھ بی۔اے۔کیا۔ ۱۹۵۰ء میں بمبئی ہی سے فارسی میں ایم۔اے۔کرنے کے بعد سرکاری ملازم ہوگئے۔ ۱۹۶۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے۔کیا۔ رحم علی الہاشمی نے اپنی کتاب ''یادیں'' مطبوعہ اکتوبر ۱۹۷۶ء (کتاب کار علی گڑھ) میں لکھا ہے:

> ''---نیشنل آرکایوز میں ترمذی صاحب کا میرا بہت دن ساتھ رہا۔اور وہ ہمیشہ مجھ سے خلوص اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ وہ آرکائیوز کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔اور پبلک سروس کمیشن نے ان کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے پیشتر یہ اجمیر کالج میں تاریخ کے اُستاد تھے۔تاریخی معلومات اور تاریخی مواد سے کافی واقفیت رکھتے ہیں اور تاریخی تحقیق کے شایق ہیں---''۔

موصوف جون ۱۹۸۲ء کو نیشنل آرکائیوز آف انڈیا سے بحیثیت ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں تاریخ کے وزیٹنگ پروفیسر مقرر ہوئے۔ سرینگر سے نکلنے والے مجلّہ ''گزیٹر'' کے چیف ایڈیٹر رہے۔اس سے قبل ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل ریسرچ کے اعزازی ڈائریکٹر ہوئے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس،

ٹیکنالوجی اینڈ ڈولپمنٹ اسٹڈیز میں مشیر رہے۔ قدیم وجدید تاریخ اور ثقافت وتمدن سے خصوصی دلچسپی کی بناء پر تقریباً آٹھ برس یونیسکو میں ایشین اسٹڈیز کے شعبہ سے بھی تعلق رہا۔ موصوف نے حکومتِ ہند کے نمائندہ کی حیثیت سے امریکہ، افریقہ اور یورپ کے ملکوں بشمول اسپین کے علاوہ مختلف ایشیائی ممالک میں محکمۂ آثار قدیمہ کے تعلق سے منعقد ہونے والے سمیناروں میں شرکت کی، اُن کا معرکۃ الآراء مضمون ''ہندوستانی دفتر خانوں میں فارسی دستاویزیں''، عِلمی مجلسِ دلّی کے سہ ماہی رسالہ ''تحریر'' میں جولائی تا ستمبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا، جس کے مرتب مالک رام تھے۔

تاریخ، تحقیق اور تدوین سے انھیں خصوصی شغف تھا اور انگریزی، فارسی اور اردو کے ادیب کی حیثیت سے وہ اپنی ایک پہچان رکھتے تھے۔ ساٹھ سے زیادہ تحقیقی مضامین دنیا کے مختلف رسائل وجرائد کی زینت بنے ہیں۔ ان موضوعات پر ان کی تقریباً دو درجن کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں ہندوستانی تاریخ کے ماخذ، مغل دستاویز کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد اور جدید ہندوستان، نیز یونیسکو گائڈ ادبی حلقوں میں اعتبار کا درجہ رکھتی ہیں۔

'نامہ ہائے فارسی غالبؔ' (Persian Letters of Ghalib) ان کی زبردست دریافت ہے۔ دو سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب فروری ۱۹۶۹ء میں غالبؔ اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب پر پچاس صفحات پر مبنی انگریزی میں ان کا تعارف نامہ بیحد وقیع ہے۔ اس میں مسودہ میں شامل تمام فارسی خطوط کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مدلل اور موثر مقدمہ قائم کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> ''غالبؔ کے فارسی خطوط کا ایک بے یار و مددگار مسودہ محفوظ رہ گیا ہے جسے شائع کیا جارہا ہے۔ یہ خطوط بہت اہم ریکارڈ فراہم کرتے ہیں۔ شاعر کے سفرِ کلکتہ کے بارے میں یہ تفصیلات اب تک سامنے نہیں آئی تھیں''۔

سید اکبر علی ترمذی تفہیمِ غالبؔ میں اِن مکاتیب کی حوالہ جاتی حیثیت اور افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان خطوط سے شاعر کی زندگی اور فن کے بارے میں نئے حقائق پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز ان خطوط اور ضمیموں سے جو اس مجموعہ میں پیش کیے جارہے

ہیں، ایک ایسا مرقع تشکیل پاتا ہے، جس سے شاعر کی دہلی سے غیر حاضری اور کلکتہ کے عارضی قیام کی تصویریں سامنے آتی ہیں''۔

اِس مجموعۂ مکاتیب کی نیرنگی اور انفرادیت کے تعلق سے وہ ''دیباچہ'' میں رقم طراز ہیں:

''۱۹۶۰ء میں میرے اِیما پر نیشنل آرکایوز آف انڈیا سے یہ مجموعہ حاصل کیا گیا اور چونکہ اس کا موضوع میرا میدان نہیں تھا، میں نے اپنے دوست قاضی عبدالودود صاحب سے، جو ایک مسلمہ غالبؔ شناس ہیں، درخواست کی کہ ان خطوط کو مرتب فرمائیں۔ انھوں نے میری درخواست کو قبول فرمایا اور ۱۹۶۱ء میں چھ خطوط علمی رسالہ ''تحقیق'' میں شائع فرمائے۔ لیکن بعض اور کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے اُنھیں اس کام کے لیے وقت نہ ملا اور گزشتہ اکتوبر میں انھوں نے رائے دی کہ میں خود اس کام کو سرانجام دوں''۔[1]

ترمذی صاحب اُس وقت شعبۂ آثارِ قدیمہ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے اہم کاغذات کی ترتیب وتدوین میں بے حد مصروف چل رہے تھے لیکن قاضی عبدالودود صاحب کے مشوروں اور حوصلہ افزائی سے وہ اس جانب یکسوئی سے متوجہ ہوئے۔ لکھتے ہیں:

''جب میں نے اس مجموعہ کو باریک بینی سے پرکھا تو اس کام کو بے شمار مشکلات سے پُر پایا--- اول یہ کہ میرے پاس صرف ایک مسودہ تھا جس سے مجھے تدوین کا کام کرنا تھا۔ دوسرے، یہ قلم برداشتہ غیر دوستانہ اُسلوب میں لکھا ہوا تھا۔ تیسرے، اسے کئی مقامات پر کیڑوں نے کھالیا تھا---مگر ان سب مشکلات کے باوجود میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ متن کو برقرار رکھوں تاہم جو چند خلا رہ گئے ہیں، ان کی جانب فنِ طباعت کی مختلف اِختراعات سے اشارہ کردیا گیا ہے''۔ (مکتوباتِ غالبؔ، ص:۱۰)

غالبؔ صدی (۱۹۶۹ء) کے موقع پر شائع ہونے والی کتابوں میں شاید سید اکبر علی ترمذی کی

یہ کتاب سب سے اہم ہے جو مزید تحقیق کے در وا کرتی ہے۔ لطیف الزماں خان اِس کی خوبیوں کو گنواتے ہوئے ''مکتوباتِ غالبؔ'' (مطبوعہ دسمبر ۱۹۹۵ء) میں لکھتے ہیں:

(i) تعارف، دیباچہ اور مقدمہ انگریزی میں ہے جو ہر اعتبار سے معتبر اور مستند ہے۔ مذکورہ کتاب اُس توجہ سے محروم رہی جس کی یہ مستحق تھی۔

(ii) غالبؔ نے چار سال کے عرصہ میں اپنے احباب خصوصاً محمد علی، صدر امین باندہ کو جو خطوط لکھے، وہ انتہائی اہم ہیں۔ یہ خطوط نہ صرف سفرِ کلکتہ کے تعلق سے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اُس پورے عہد کو سمجھنے میں معاون ہیں۔

(iii) یہ مکتوبات اس اعتبار سے بھی نہایت قیمتی ہیں کہ سید اکبر علی ترمذی نے مسودہ کی خستگی کو باریک بینی سے دیکھتے ہوئے بعض مقامات پر جو اشعار، مصرعے وغیرہ غائب ہو رہے تھے اُنھیں دیگر کلیات سے نقل کرتے ہوئے ماہرین غالبؔ کی مدد لی ہے۔

خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ دانشورانِ ادب سے یہ شکوہ بھی کرتے ہیں کہ مذکورہ کتاب اُس توجہ سے محروم رہی جس کی یہ مستحق تھی۔

قاضی عبدالودود نے لطیف الزماں کی کتاب ''مکتوباتِ غالبؔ'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

> ''جنابِ سید اکبر علی ترمذی نے غالبؔ کے فارسی خطوط دریافت کیے ہیں جو غالبؔ کے سفر کلکتہ کے بارے میں ہمارے علم میں اہم اور حقیقی اضافہ کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک جامع تعارف کے ساتھ ان خطوط کو مرتب کیا ہے اور بڑی محنت سے شاعر کے بیانات کا تقابلی مطالعہ اُس خارجی شہادت سے کیا ہے جو حکومتِ ہند کے سرکاری رکارڈ میں موجود ہے۔ اُن کی یہ کوشش قابل تعریف ہے کہ مختلف اثرات جو شاعر کے ذہن پر مرتب ہو رہے تھے اُن پر تحقیق کی ہے... اِن خطوط کو تاریخی ترتیب دینے میں بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے۔ اصل عبارت کے استقرار، اشخاص اور مقامات کے نام جو اُن خطوط میں آئے ہیں ان کے تعیّن کے سلسلہ میں بڑی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے---''۔

نامہ ہائے فارسی غالبؔ یعنی Persian Letters of Ghalib کا مسودہ کس طرح محفوظ رہ گیا، اس پر سید اکبر علی ترمذی بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''---مجموعہ کا مسودہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نے ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ سید محمد رفیع نقوی سے حاصل کیا جو کارا کے رہنے والے ہیں۔ کارا اُتر پردیش ضلع الٰہ آباد کا ایک تاریخی قصبہ ہے، سید علی حسن خاں اسی قصبہ کے رہنے والے تھے جنھوں نے ان خطوط کو نقل کیا تھا۔ مسودہ کے اختتام پر بہ زبانِ انگریزی یہی لکھا گیا ہے۔ بہرکیف اس بات کا علم قطعیت کے ساتھ نہیں ہوسکا کہ یہ مجموعہ کب مرتّب ہوا اور کب نقل کیا گیا لیکن اس کا امکان ہے کہ یہ ۱۸۳۹ء میں لکھا گیا۔ یہ بات ضلع باندہ پرگنہ بادوس اور کالنجر کے تحصیل دار سید افضل علی کے ایک خط سے معلوم ہوتی ہے جو ۵/اگست ۱۸۳۹ء کو منشی سید علی حسن خاں کو ان کے باندہ کے پتہ پر لکھا گیا (خط نمبر ۳۳)۔ منشی سید علی حسن خاں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا لیکن بادوسا۲ اور کالنجر۳ کے تحصیل دار نے جس عزّت وتکریم کے ساتھ اُنھیں مخاطب کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ باندہ کی انتظامیہ کے تحت خاصے بڑے عہدے پر فائز رہے ہوں گے۔ امکان ہے کہ ان خطوط کو وہیں نقل کیا گیا۔ اس مفروضہ کی اضافی تصدیق اِس حقیقت سے ہوتی ہے کہ اس مجموعہ میں غالبؔ کے خطوط کی بڑی تعداد باندہ کے صدر امین یا سول جج مولوی محمد علی صاحب کو لکھے گئے ہیں''۔

''نامہ ہائے فارسی غالبؔ'' کی اشاعت کے بعد ہی سفرِ کلکتہ کی مکمل تصویر اُبھرتی ہے اور اِس تصویر کے کینوس پر جو منظر نامہ چھا جاتا ہے وہ محمد علی صدر امین باندہ کا ہے۔ یہ بیش قیمت مسودہ ۳۳/ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر سطر پر اٹھارہ سطور ہیں جن کی پیمائش "۱۰×"۷ ہے۔ چونتیس خطوں میں سے بتیس خط غالبؔ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں باقی دو خط منشی سید علی حسن کو اُن کے احباب نے لکھے ہیں۔ ان بتیس خطوط کے علاوہ جن میں خط نمبر ۵، خط نمبر ۲ کی نقل ہے۔ مسوّدہ میں دو نثر

پارے، کلکتہ میں غالبؔ کی ادبی محاذ آرائی کے بارے میں ہیں۔ یہ نثر پارے اس کتاب کے ضمیمے ۱-۲ کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ مسوّدہ خطِ شکست میں ہاتھ سے بنے ہوئے کاغذ پر سیاہ کاربن روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ بہت سے مقامات پر ایسے کیڑوں نے کھالیا ہے، جگہ جگہ سوراخ ہو گئے ہیں جن میں سے اکثر کو میں نے کلیاتِ نثر غالبؔ یا کلیات غالبؔ کی مدد سے پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں ان دو کتابوں سے مجھے مدد نہیں ملی، وہاں میں نے قوسین میں اپنی قیاسی عبارت لکھی ہے۔ بہ صورتِ دیگر ان مقامات کو جنھیں کیڑوں نے چاٹ لیا ہے، نقطوں کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ مسوّدہ میں کرم خوردگی کے علاوہ ایک ستم یہ ہے کہ اس میں تاریخ درج نہیں کی گئی ہے۔ جن خطوط میں تاریخ لکھی ہے وہاں سال نہیں دیا گیا ہے۔ نہ ہی خطوط کو کسی خاص تسلسل سے ترتیب دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اِن کے مطالعہ سے انتشار، ابتری اور بے ترتیبی کا احساس ہوتا ہے۔ دنوں اور تاریخوں کو مقابلہ اور اندرونی شہادت کی مدد سے میں نے تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ ہر خط کے اوپری سرے پر شمار کنندہ تاریخی ترتیب کا تعین کرتا ہے اور نسب نما مسودہ میں پائے جانے والے خط کے مقام کو ظاہر کرتا ہے:

> ''اوّل تو اِن خطوط کی تاریخی ترتیب غلط ہے، دوسرے یہ کہ مکتوب الیہ حضرات کے نام نہیں ہیں۔ سوائے خط نمبر ۳۱ر کے جہاں مکتوب الیہ کا نام ہگلی کے نواب اکبر علی خاں دیا گیا ہے۔ یہ خط ذرا سی تبدیلی کے ساتھ پنج آہنگ کی ابتداء ۶ میں ملتا ہے۔ اس مجموعہ میں سات خطوط اور ہیں جو پنج آہنگ میں موجود ہیں۔ اگر چہ کہ ان سات خطوط کی عبارت ذرا مختلف ہے لیکن پنج آہنگ میں ان کے مکتوب الیہ کا نام مولوی محمد علی خاں باندہ دیا گیا ہے۔ ۷

اس مشابہت سے مجھے ہمّت ملی۔ میں نے عبارت کا غور سے مطالعہ کیا اور قوی باطنی شہادت کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچا کہ باقی ماندہ ۳۱ر خطوط میں سے ۲۷ر خط باندہ کے مولوی محمد علی خاں کو لکھے گئے ہیں۔ ایک خط ہُگلی کے نواب سید علی اکبر خاں طباطبائی کو لکھا گیا ہے۔ دو خطوط

کے مکتوب الیہ اور ان کے پتوں کی شناخت نہیں ہوسکی''۔

قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ ترمذی کے اِس اقتباس کی کئی باتیں مرتب کے لیے پریشان کن تھیں۔ مثلاً مسودہ کے اُن حصّوں کو جنھیں کیڑوں نے کھالیا تھا، اُس سے پیدا ہونے والے خلا کو انھوں نے مستند اور معتبر حوالوں سے پُر کرنے کی امکانی کوشش کی۔ مکتوب الیہ سے قاری کو ممکن حد تک متعارف کرایا۔ ابتری اور بے ترتیبی کو دُرست کیا۔ تاریخی ترتیب کو بھی ماہ سال کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نمبر۱۔ ''ان خطوط کے مکتوب الیہ مولوی محمد علی خاں، اُتر پردیش ضلع اُناوٗ کے قصبہ موہان کے رہنے والے تھے۔ اور کلکتہ کی صدر عدالت کے قاضی القضاۃ یا قاضی اعظم سراج الدین علی خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ محمد علی خاں، برطانوی انتظامیہ کے زیرِ انصرام بندیل کھنڈ میں مفتی کے بڑے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا کلام اسلامی قوانین کی تفسیر وتشریح کرنا تھا، بعد میں وہ ترقی پاکر باندہ میں صدر امین یا سول جج ہوگئے۔ یہ بڑا اہم عہدہ تھا۔ یہ منصب اُس وقت بھی اُن کے پاس تھا جب غالبؔ ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۲۷ء میں باندہ سے گزر کر کلکتہ جارہے تھے۔ یہ عہدہ انتقال تک اُن کے پاس رہا۔ اُن کا انتقال ۱۲۴۷ھ/۳۲-۱۸۳۱ء میں ہوا۔ وہ مختلف اصناف میں شعر کہتے تھے اور فارسی میں بھی بغیر کسی تخلص کے شاعری کرتے تھے''۔ (بحوالہ علی حسن خاں، صبح گلشن ص ۳۷۹، کلیات نثر، ص ۱۶۴، قاضی عبدالودود، مآثر غالبؔ، ص:۳۹)

نمبر۲۔ ''علی اکبر خاں سے ملنے کے فوراً بعد باندہ کے مولوی محمد علی خاں کی ہدایت کے مطابق غالبؔ قاضی القضاۃ کی قبر پر پہنچے۔ ۲۰؍رمضان ۱۲۴۳ھ مطابق اتوار ۶؍اپریل ۱۸۲۸ء کو مرحوم قاضی صاحب کی بیوہ کے ہاں اُن کی رہائش اینٹلی میں مولوی محمد علی خاں کا تعارفی خط لے کر پہنچے۔ مولوی غلام علی نے بیگم صاحب سے غالبؔ کا تعارف کرایا۔ انھوں نے

پس پردہ رہ کر نہایت لطف اور گرم جوشی سے گفتگو کی۔انھوں نے یہ بھی کہا کہ شملہ بازار شہر سے بہت دور ہے۔اپنے بھانجے ولایت حسین کے سفر سے آنے کے بعد غالب کو اپنے گھر میں قیام گاہ فراہم کریں گی''۔ (خط ۶-۷)

(کچھ محققین نے لکھا ہے کہ غالبؔ کلکتہ پہنچنے کے تیسرے دن یعنی ۲۲/فروری کو مذکورہ خط لے کر علی اکبر خاں کے گھر گئے تھے اور دو ڈھائی گھنٹہ قیام کر کے واپس آ گئے تھے۔ دو دن بعد دوبارہ گئے اور رات قیام بھی کیا۔تیسری بار دہلی روانگی سے قبل وہاں گئے اور پانچ دن قیام کیا۔)

نمبر۳-''۲۰/جون ۱۸۲۸ء کو غالبؔ نے باندہ کے مولوی محمد علی خاں کو خط بھیجا اور یہ درخواست کی کہ ان کے لیے مزید ایک ہزار روپے قرض حاصل کیے جائیں---''۔(خط نمبر ۹)

نمبر۴-''---۹/اکتوبر ۱۸۲۸ء کو غالبؔ کے پاس سو روپے رہ گئے تھے کہ باندہ کے مولوی محمد علی خاں کی جانب سے مولوی ولایت حسین کے توسط سے ایک ہنڈوی ملی۔غالبؔ خوشی سے پھولے نہ سمائے اور خود بازار گئے تاکہ مالک اور ہنڈوی کی رقم کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں''۔(خط نمبر ۱۱)

نمبر۵-''۱۰/مارچ ۱۸۲۹ء کو انھوں نے باندہ کے مولوی محمد علی خاں کو خط بھیجا کہ وہ نواب ذوالفقار علی خاں سے درخواست کریں کہ باندہ کے امین (امی) کرن سے مزید ایک ہزار روپیہ قرض حاصل کریں۔مرزا مغل کے چھوٹے بھائی مرزا ازبک جان کے لیے انھوں نے ایک خط لفافہ میں رکھ دیا۔لکھا تھا کہ نواب صاحب کو ترغیب دلائے کہ اُن کی درخواست مان لی جائے''۔(خط نمبر ۱۸)

نمبر۶-''---اِن گزارشات کے نتیجے میں شوال ۱۲۴۴ھ مطابق ۲/مئی

۱۸۲۹ء کے آخر میں باندہ کے مولوی محمد علی نے انھیں ایک شاہ جوگ ہنڈوی بھیجی۔ غالبؔ نے ہنڈوی مولوی ولایت حسین کو دی اور وہ اُس کے عوض دوسو روپے لے آئے''۔ (خط نمبر ۲۰)

نمبر ۷- ''غالبؔ نے باندہ کے مولوی محمد علی کو ۸؍محرم ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۰؍جولائی ۱۸۲۹ء کو لکھا کہ دلّی میں منشی محمد محسن کو تاکید کریں کہ ان کے کاغذات جس قدر جلد ممکن ہو روانہ کردیں۔ اسی خط میں اُنھوں نے دو مادّہ ہائے تاریخ بھی لکھے''۔ (خط نمبر ۲۲)

نمبر ۸- ''۱۳؍صفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۴؍اگست ۱۸۲۹ء کو انھوں نے اپنا سامان کشتی کے ذریعہ باندہ روانہ کردیا اور خود پنج شنبہ یا جمعہ ۱۹؍یا ۲۰؍صفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۲۰؍۲۱؍اگست ۱۸۲۹ء کو روانہ ہوئے--- ۳۰؍اکتوبر ۱۸۲۹ء کو باندہ پہنچے--- ہفتہ یکم جمادی الاول ۱۲۴۵ء مطابق ۷؍نومبر ۱۸۲۹ء کو باندہ سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے---اتوار ۲۹؍نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی واپس پہنچے''۔ (خطوط ۲۴-۲۸)

نہایت دیانت دارانہ ترتیب و تنظیم اور ممکن وضاحتوں کے باوجود مسوّدہ کی خستگی سے پیدا ہونے والی قباحتیں، اور خطوط کی صحیح تعداد کے تعین میں جو ضمنی کمیاں رہ گئیں، انھیں پہلے لطیف الزماں خاں نے دُور کرنے کا جتن کیا پھر نہایت یکسوئی اور دلجمعی سے پرتؔو روہیلہ نے اِسے سرانجام دیا۔ انھوں نے غالبؔ کے منتخب فارسی مکتوبات (اردو ترجمہ ۲۰۰۶ء، دوسرے ایڈیشن ۲۰۰۹ء اور ''کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالبؔ'' مطبوعہ ۲۰۱۰ء کے پیش لفظ میں جو وضاحت درج کی ہے اس سے قاری بڑی حد تک مطمئن ہو جاتا ہے۔ پہلا اقتباس:

''نامہ ہائے فارسی غالبؔ کے ترجمے کے لیے میرے پیش نظر سید اکبر علی ترمذی کا وہ مرتبہ نسخہ تھا جو پہلی بار غالبؔ اکیڈیمی نظام الدین-نئی دہلی ۱۳، انڈیا سے ۱۹۶۹ء میں طبع ہوا۔ اس نسخہ کی اہم چیز مرتب کا وہ انگریزی کا چون (۵۴) صفحے کا دیباچہ ہے جو اس کی اہمیت کو بڑھاتا اور متن کے

سینکڑوں حقائق کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن اصل متن میں کاتب کی بدخطی اور حیران و پریشان کن تحریفات کے علاوہ سب سے بڑی قباحت اس مخطوطہ کی کرم خوردگی تھی جس کے سبب نثر کے اس شاہکار میں قدم قدم پر شدید بدمزگی اور بے لطفی در آئی تھی۔ مرتب کے لیے اس مشکل سے گلو خاصی بہت آسان تھی کہ کرم خوردہ جگہوں پر نقطے ڈالے اور آگے بڑھ گئے لیکن مترجم کو جملے اور عبارت کے سیاق و سباق کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ بھی متعین کرنا تھا کہ نقطہ زدہ جگہ سے ایک لفظ غائب ہے یا ایک جملہ یا کئی سطریں کہ ترجمے کی روانی قائم رکھنے کے لیے اس کو اپنے طور پر قیاسی الفاظ سے خالی جگہ کو پُر کرنا بھی ہوتا تھا۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے میں نے اُس وقت کے ڈائریکٹر جنرل نیشنل آرکایوز (Archaives) اسلام آباد سے رابطہ کیا اور گزارش کی کہ وہ اپنے ہندوستانی ہم منصب سے اگر اس مخطوطے کی مائیکرو فلم منگوا سکیں تو ہماری مشکل قدرے کم ہو جائے گی لیکن یہ نہ ہو سکا۔ نتیجتاً یہ ساری خالی جگہیں اس طرح رہ گئیں اور ہماری زندگی کے سینکڑوں توجہ طلب شعبوں کی طرح اس منصوبے پر بھی بدنما داغ کی طرح باقی ہیں۔ مترجم نے البتہ حتی المقدور اپنے قیاسی الفاظ سے ان جگہوں کو پُر کیا ہے اور بریکٹ میں لفظ قیاسی لکھ بھی دیا ہے۔ لیکن جہاں ترتیب ٹوٹ جاتی ہے اور مفہوم بھی ساتھ نہیں دیتا اور ظاہر ہوتا ہے کہ خلا وسیع ہے وہاں نثر کے متعلقہ ٹکڑے کا اسی طرح ترجمہ کر کے بریکٹ میں لفظ ''نامکمل'' لکھ دیا گیا ہے''۔

پرتؔو روہیلہ کا یہ دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ ہو۔

''نامہ ہائے فارسی غالبؔ میں نمبر شمار کے مطابق ۳۱ رخطوط ہیں ترمذی صاحب کے دیباچہ کے مطابق اس میں ۲۷ رخطوط باندے کے محمد علی خان کے نام ہیں۔ ایک خط نواب سید علی اکبر خان طباطبائی کے نام ہے اور دو

خطوط کے مکتوب الیہ ''مردمان معین'' ہیں۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر شروع میں فہرست کے آخر میں ''مردمان نامعین'' کا ایک علیحدہ عنوان دے کر خطوط نمبر اٹھائیس (۲۸)، انتیس (۲۹) اور تیس (۳۰) کو اسی میں ڈالا گیا تھا لیکن فاضل محقق و غالبؔ شناس ڈاکٹر حنیف احمد نقوی سابق پروفیسر اردو ڈپارٹمنٹ بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی ہندوستان کی تحریری ہدایت پر کہ اس مجموعہ میں صرف دو خط ۲۸-۲۹/ص: ۹۰ اور ۳۱-۳۲، ص: ۱۰۰ نواب علی اکبر خاں طباطبائی کے نام جب کہ باقی تمام خطوط محمد علی خان صدر امین باندہ کے نام ہیں۔ فہرست مکتوب الیہم میں ضروری تبدیلی کر لی گئی ہے اور اب ''مردمانِ نامعین'' کو فہرستِ مکتوب الیہم سے خارج کر دیا گیا ہے۔ میرے لیے یہ سعادت ہے کہ مجھے موصوف کی اس مستند رائے سے بروقت آگاہی مل گئی اور نتیجتاً ترتیب کا ایک بڑا سقم دور ہوگیا''۔

سید اکبر علی ترمذی کے دریافت شدہ مسودہ کی بدولت یہ بات بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ کلکتہ میں غالبؔ کو جو مخلص اور قابل اعتبار دوست مثلاً مولوی سراج الدین احمد، مولوی عبدالکریم، منشی عاشق علی خاں، آغا محمد حسین، مرزا احمد بیگ تپاںؔ میسر آئے، وہ باندہ اور وہاں کے لائق صدر احترام دوست محمد علی صاحب کی بدولت ملے۔ اِس گراں قدر کام کی وجہ سے پرتوؔ روہیلہ، لطیف الزماں، قاضی عبدالودود ہی نہیں عصرِ حاضر کے غالبؔ کے شیدائی ادیب بھی سید اکبر علی ترمذی کو غالبیات کے مطالعات کی فہرست میں بخوشی شامل کرتے ہیں۔ بلاشبہ انھوں نے نہایت توجہ، محنت اور لگن سے دیوان محمد علی کے نام لکھے گئے غالبؔ کے خطوط دریافت کیے ہیں، اور مکتوب الیہ پر جس طرح روشنی ڈالی ہے وہ لائقِ تحسین و ستائش ہے۔

○○○

حواشی

۱۔ ''نامہ ہائے فارسی غالبؔ'' کے فارسی متن اور طویل انگریزی مقدمہ کا اردو ترجمہ لطیف الزماں خاں نے ''مکتوباتِ غالبؔ'' کے نام سے دسمبر ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔

۲۔ ضع باندہ میں تحصیل اور پرگنہ ڈی. ایل ڈریک بروخ مین، باندہ اے گزیٹر (الہ آباد ۱۹۰۹ء) صفحات، ۷-۲۰۳

۳۔ مشہور پہاڑی قلعہ اور قصبہ تحصیل گردان باندہ ایضاً، ص: ۴۷-۲۳۴

۴۔ کانپور ایڈیشن ۱۸۷۵ء

۵۔ مرتبہ امیر حسن نورانی، لکھنؤ، ۱۹۶۸ء

۶۔ کلیاتِ نثر غالبؔ، ص: ۹۶

۷۔ کلیاتِ نثر غالبؔ، ص: ۱۷-۱۶۴

غالبؔ شناس: لطیف الزماں خاں

(۱۳؍مارچ ۱۹۲۴ء-۲۶؍دسمبر ۲۰۱۳ء)

لطیف الزماں خان انگریزی زبان وادب کی درس وتدریس سے وابستہ رہے اور ہمیشہ ایک اچھے اُستاد کے فرائض انجام دیئے۔ یہ ہُنر انھوں نے اپنے اُستادِ معنوی رشید احمد صدیقی سے سیکھا اور اُن کی پیروی کے طور پر علی گڑھ کے درودیوار کو بھی عزیز رکھا۔ البتہ غالبؔ عقل وذہن اور قلب وجگر پر حاوی رہے۔ غالبؔ، رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ سے بے پناہ اُنسیت ورغبت کی وجہ سے وہ تمام عمر اردو میں لکھتے پڑھتے رہے۔ بقول ڈاکٹر ابرار عبدالسلام وہ ''ہندوستانی تہذیب، علی گڑھ، اردو، غالبؔ اور رشید احمد صدیقی سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ یہ پانچوں عناصر ان کی تحریروں، سوچ، ذہن، رویوں، افکار اور خیالات پر گھنے بادلوں کی طرح چھائے رہے۔ انھوں نے ان عناصر سے فقط محبت کا دعویٰ ہی نہیں کیا، اس کا عملی ثبوت بھی فراہم کیا ہے''۔[1]

بے حد حساس ذہن کے مالک لطیف الزماں خاں محقق، نقاد اور مترجم کے ساتھ انشاء پرداز[2] اور خاکہ نگار[3] کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ ادبی حلقہ میں اُن کی شہرت اور مقبولیت غالبؔ شناس کے طور پر بھی قائم ہوئی ہے۔ ڈاکٹر شکیل پتافی جنھوں نے ''پاکستان میں غالبؔ شناسی'' کے عنوان سے پی ایچ.ڈی. کا مقالہ مکمل کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون ''لطیف الزماں خاں بحیثیت غالبؔ شناس'' میں رقم طراز ہیں:

''انھوں نے 'نامہ ہائے فارسی غالبؔ' (مرتبہ سید اکبر علی ترندی) کا اردو ترجمہ 'مکتوباتِ غالبؔ' کے نام سے شائع کیا۔ اس ترجمہ کے ذریعہ سے غالب کے فارسی خطوط کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ جس سے اُس زمانے کے سماجی وسیاسی، معاشی وثقافتی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ

خطوط کا با محاورہ اردو ترجمہ ہے۔ اسے ترجمہ نگاری کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے۔ متن میں موجود ادق اور مشکل تراکیب کو نہایت اچھوتے اور عام فہم انداز میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس ترجمے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے حواشی اور حوالہ جات کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے''۔[۴۲]

غالبؔ کے اِس عاشقِ بے بدل کے ان گنت واقعات ادیبوں کو ازبر ہیں جن کو تقویت رضی الدین رضی کے اِس بیان سے بھی ملتی ہے:

''غالبؔ کو تو انھوں نے حفظ کر رکھا ہے، کون سا شعر کس موقع پر کہا گیا، کون سا خط کس کے نام اور اس کا متن کیا ہے۔ یہ سب کچھ ہمیں ملتان ہی نہیں کم از پاکستان میں تو ایک ہی شخص بتا سکتا ہے اور وہ ہے لطیف الزماں خاں، بظاہر سخت گیر لیکن حقیقت میں نرم دل اور محبت کرنے والا انسان''۔ (روزنامہ جنگ ملتان، ۱۸ر مئی ۲۰۰۷ء)

اِس ماہرِ غالبؔ نے جب وطنِ ثانی میں مستقل آشیانہ کی تعمیر کا منصوبہ بنایا تو بھی درودیوار پر اُگتے ہوئے نقش ونگار غالبؔ سے ہی مستعار رہے۔ اس کا بین ثبوت ملتان کی گل گشت کالونی میں حالؔی روڈ پر B-149 کی قطار میں بنا مکان ''غالبؔ نُما'' ہے۔ محبت اور عقیدت کے اینٹ گارے سے تعمیر ہونے والا ''غالب نُما'' تشنگانِ علم کے لیے کسی بھی نعمت سے کم نہیں ہے۔ اکتسابِ علم کے فیضان کی بنا پر آج مکین ومکان یہ دونوں غالبیات کی فہرست کے جُز قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

عمرِ گزشتہ کو آواز دیتے ہوئے 'غالب نُما' کے مکین کے سوانحی کوائف پر نظر ڈالیں تو وہ ۱۳ر مارچ ۱۹۲۴ء میں بھیلواڑہ، ریاست میواڑ (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ سر ٹیفکیٹ میں اُن کی پیدائش ۱۴ر مارچ ۱۹۲۶ء درج ہے۔ والد عبداللطیف خاں محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ دادا ظہور احمد خاں مذہب کے ساتھ ساتھ شعروادب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ لطیف الزمان نے بھیلواڑہ کے مکتب میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک مولوی احمد حسن سے قرآن پڑھی۔ ابتدائی تعلیم کنور پدا اسکول، جگدیش چوک، اودے پور میں حاصل کرتے ہوئے ۱۹۳۸ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ چھٹی کلاس سے آٹھویں جماعت تک مہارانا مڈل اسکول، چتوڑ گڑھ میواڑ میں تعلیم حاصل کی، پھر اسی کے انٹر سیکشن میں آ گئے اور ۱۹۴۵ء میں میٹرک پاس کیا۔ بارھویں جماعت میں داخل

ہوئے تھے کہ بٹوارے نے شدید فسادات کی شکل اختیار کرلی۔ اِس پُر آشوب دور میں وہ اپنی ننھیال قصبہ اترولی ضلع علی گڑھ آگئے اور اُس گرم آندھی کے تھپیڑوں میں ۱۱/مارچ ۱۹۴۸ء کو علی گڑھ سے کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔ اگلے سال علی گڑھ واپس آئے تاکہ بچپن میں بزرگوں کے کیے گئے وعدہ کو رشتہ کی شکل دی جاسکے۔ نہایت سادگی کے ساتھ ۱۳/جون ۱۹۴۹ء کو اترولی، علی گڑھ میں قمر النساء سے اُن کی شادی ہوئی۔[۵] ۱۹۵۲ء میں والدہ اور چھوٹے بھائی بہن کو بھی علی گڑھ سے کراچی لے گئے۔ انٹر اور بی.اے. اردو کالج کراچی سے پاس کیا۔ ۱۹۵۹ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم.اے. انگریزی ادبیات میں کیا اور اسی سال گورنمنٹ کالج رحیم یار خاں کے شعبۂ انگریزی میں اُن کا تقرر ہوگیا۔ مختلف جگہوں پر تبادلے ہوتے رہے۔[۶] ملتان کے گورنمنٹ کالج میں تعینات تھے اور ''غالب نما'' کا ذہن میں خاکہ ترتیب دے رہے تھے کہ ۲۹/نومبر ۱۹۶۶ء کو والد عبداللطیف خاں کا اترولی، علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ تدفین میں تو وہ شریک نہیں ہوسکے لیکن اُن کی برسی پر ایک ہفتہ کے لیے علی گڑھ آئے اور برابر رشید احمد صدیقی کی خدمت میں بھی حاضری دیتے رہے۔ ۱۳/مارچ ۱۹۸۶ء میں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج ملتان سے ریٹائر ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد غالبؔ پر خصوصی توجہ دی اور اور اِس سلسلہ میں وہ کئی بار ہندوستان آئے۔ خاص طور سے ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۶ء میں۔

۱۹۶۹ء میں بین الاقوامی سطح پر غالبؔ کو یاد کیا گیا۔ اس صدی تقریبات نے جو اہم کتابیں فراہم کیں ان میں سید اکبر علی ترمذی کی Persian Letters of Ghalib کو دیکھ کر اُنھیں دلی مسرت ہوئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ محکمۂ آثار قدیمہ میں ملازم، تاریخ کا اُستاد، غالبؔ کے غیر مطبوعہ بلکہ نایاب فارسی خطوط جو محمد علی، صدر امین باندہ کے نام تھے، اُن کو باقاعدہ ترتیب دیتے ہوئے وضاحت وصراحت سے کام لیتا ہے۔ تحقیق وتدوین کے اصول وضوابط سے واقفیت رکھنے والے کے ساتھ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جن نایاب مکتوبات کی حصولیابی میں برسوں لگے تھے، اُنھیں صرف چار ماہ میں کتابی شکل میں عوام کے سامنے پیش کردیا گیا تھا۔ عجلت میں ایسا کیوں ہوا؟ اِس کا اعتراف ترمذی صاحب نے انگریزی میں لکھے اپنے طویل مقدمہ میں کیا ہے۔ یہ ادبی دیانتداری اور مرتب کی صاف گوئی خاں صاحب کو پسند آئی۔ انھیں یہ ادا بھی اچھی لگی کہ فارسی کے

دریافت شدہ خطوط پر مکمل گفتگو سید اکبر علی ترمذی نے انگریزی میں کی تھی جس نے عالمی سطح پر نئے سِرے سے غور و فکر کی دستک دی۔ حیرت و مسرت کی اِس مِلی جُلی کیفیت میں لطیف الزماں خاں کو جہاں جہاں کمیاں محسوس ہوئیں اُن کی نشاندہی کا تہیہ کرتے ہوئے کام کو ترتیب دیا۔ ضخامت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لطیف الزماں خاں نے خطوط کا فارسی متن شامل نہیں کیا، اشعار اور نثری عبارت کا اردو ترجمہ کیا جو بامحاورہ اور سہل بیانی کا مظہر ہے۔ انھوں نے پیچیدہ نکات کو احسن طریقے سے اردو قالب میں منتقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''---خطوط میں بعض مقامات پر اشعار اور کہیں کہیں مصرعے غائب تھے، میں نے انھیں کلیاتِ غالب فارسی دوسرا ایڈیشن مطبوعہ کان پور ۱۸۷۲ء سے نقل کر دیا ہے''۔

مثال کے طور پر ''سیہ مستانہ رحیقِ شعلہ'' میں رحیق کتابت کی غلطی ہے۔ یہاں ''حریق'' درست ہے (ص:۶۳) اسی طرح خط نمبر۳ میں ''والدالحرام سوداگر---'' کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ یہاں عبارت مغشوش ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب سے نقل کرنے میں سہو ہوا ہے۔ میں لفظی ترجمہ کیے دیتا ہوں مگر سمجھ رہا ہوں کہ جملے باہم نامربوط ہیں۔ (ص:۶۸) اسی طرح انھوں نے کتابت کی غلطی یا سہو کو ہی نہیں دُرست کیا بلکہ مسوّدہ میں جہاں جہاں افراد کے تعلق سے غلط فہمی سامنے آئی تو اس کو بھی ٹھیک کرنے کے ممکن جتن کیے ہیں۔ مثلاً مسودہ میں جون بیلی کو غلطی سے ولیم برورتھ بیلی آئی سی ایس پڑھا گیا۔ انھوں نے سی.ای بک لینڈ ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی (لندن ۱۹۰۶ء) کے حوالہ سے دُرست کیا۔ انھوں نے شاید پہلی بار غالبؔ کے عارضی قیام کی سلسلہ وار واقعات کی تاریخوں کا تعین کیا، اور طویل خطوط کا خلاصہ بھی لکھا۔

اِس طرح محبانِ غالبؔ کے لیے 'غالبؔ نُما' کے مکین نے جدید نقطۂ نظر سے سفرِ کلکتہ، خطۂ باندہ اور دیوان محمد علی کو سمجھنے کی راہوں کو ہموار کیا۔ اُن کے اِس کام سے صغیر و کبیر میں یہ تحرک پیدا ہوتا ہے کہ اب بھی غالبؔ کی شخصیت، احباب اور فکر و فن کو سمجھنے کے کئی گوشے باقی ہیں۔ بس اِن کی جانب قدم بڑھانے کے لیے لطیف الزماں خاں جیسے عزم و استقلال، جوش اور ولولے کی ضرورت ہے۔

○○○

حواشی

۱۔ پوچھتے ہیں وہ کہ عارف کون ہے؟ ''عارفِ خستہ کے بغیر'' مرتب ڈاکٹر ابرار عبدالسلام۔ بیکن بکس گلگشت، ملتان (پاکستان)، ۲۰۱۶ء، ص: ۷

۲۔ اُن کی انشاء پردازی خطوط میں پوری طرح جلوہ گر ہے جس کے تعلق سے بہت لکھا گیا ہے۔ میں یہاں صرف ڈاکٹر صلاح الدین حیدر کا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں:
''لطیف الزماں خاں کے لکھے خطوط میں ان کی شخصیت کے تنقیدی نظریات، مشاہدات اور زندگی کے نشیب و فراز کی جھلکیاں محفوظ ہوگئی ہیں، جب سناٹا ان کی ذات پر حاوی ہونے لگتا ہے تو وہ مضطرب ہوکر دوستوں کے نام خطوط لکھتے ہیں''۔
(انشائے لطیف: مکتوب نگاری میں لطیف اضافہ-شعلۂ عشق، سیہ پوش، مطبوعہ جنوری ۲۰۱۵، ص: ۱۸)

۳۔ لطیف الزماں خاں کی خاکہ نگاری کا بھرپور جائزہ سید عامر سہیل نے ''آئینہ خیال تا بارانِ سنگ'' کے عنوان سے پیش کیا ہے جو موصوف کی کتاب ''اِن سے ملیے'' کے پہلے ایڈیشن (۱۹۹۷ء) میں بطور دیباچہ شامل ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:
''لطیف الزماں خاں کے خاکے اردو میں نئے زاویوں، رجحانات اور امکانات کے مظہر ہیں---ان کے خاکوں کی ایک نہایت اہم خوبی اُن کی زبان اور جملہ کی ساخت کا فن ہے۔ وہ جملہ بناتے نہیں بلکہ جملہ خود بخود چلا جاتا ہے''۔

۴۔ ''عارفِ خستہ کے بغیر'' مرتب ڈاکٹر ابرار عبدالسلام، ص ۱۴۳ (بیکن بکس، گلگشت، ملتان، ۲۰۱۶ء)

۵۔ ۲۹ رنومبر ۱۹۶۰ء کو بڑی بیٹی مہہ جبیں پیدا ہوئی، ۵رجنوری ۱۹۶۲ء کو بڑا بیٹا انیس الزماں، ۱۴رجون ۱۹۶۵ء کو چھوٹی بیٹی لالہ رُخ اور ۲۴رجولائی ۱۹۶۷ء کو چھوٹا بیٹا تنویر الزماں پیدا ہوا۔

۶۔ ۷راکتوبر ۱۹۶۳ء میں گورنمنٹ کالج ملتان، ۹رمئی ۱۹۶۸ء میں ڈیرہ غازی خان اور ۱۴رجون ۱۹۶۸ میں گورنمنٹ کالج، مظفر گڑھ میں تبادلہ ہوا۔ ۲۶رستمبر ۱۹۷۰ء کو وہ پھر گورنمنٹ کالج ملتان واپس آ گئے۔

نواب علی بہادر ثانی علی

پیدائش ۱۸۳۲ء۔ وفات ۱۸۷۳ء
دورِ نوابی ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۸ء (۹ برس)

غالبؔ کے فارسی مکتوبات کا شیدائی - پرتوؔ روہیلہ

(۲۳؍نومبر ۱۹۳۳ء-۲۹؍ستمبر ۲۰۱۶ء)

اردو، فارسی اور پشتو میں شاعری کرنے والے معروف شاعر پرتوؔ روہیلہ کا اصل نام مختار علی خان ہے۔ وہ ۲۳؍نومبر ۱۹۳۳ء کو بریلی (اُتر پردیش) کے ایک صاحب حیثیت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے بیٹے محمد علی خاں کے مطابق ''دفتری کاغذات میں ۱۰؍اگست ۱۹۳۳ء درج ہے جب کہ اصل تاریخ پیدائش ۲۳؍نومبر ۱۹۳۳ء ہے''۔ ایک بیاض میں پرتوؔ روہیلہ اپنے سوانحی کوائف، افسانوی ڈھنگ سے لکھ رہے تھے، اور اُس کی نقل محمد علی خاں سے حاصل کر کے پروفیسر نوشابہ صدیقی (سابق پرنسپل علامہ اقبال ڈگری کالج، مدیر ماہنامہ 'تہذیب' کراچی) نے مجھے بھیجی ہے۔ اس کے پہلے صفحہ پر لکھا ہے :

> ''پیدائش: پرتوؔ روہیلہ-۲۳؍نومبر ۱۹۳۳ء کو بریلی (یوپی، بھارت) میں ہوئی --- مارچ ۲۰۰۲ء کے ''شعر و حکمت'' میں ان کی ولادت کے بارے میں کچھ یوں لکھا گیا: ۱۰؍اگست ۱۹۳۳ء کو پاکستان کے علاقے بنوں میں پیدا ہوئے، جو کہ دُرست نہیں ہے---''۔

اپنی بیاض میں پرتوؔ روہیلہ نہایت دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں:

> ''--- اس سوانح کا سب سے پہلا سانحہ تو میری پیدائش ہی ہے جو ۲۳؍نومبر ۱۹۳۳ء کو بمقام بریلی، یوپی۔ بھارت ہوئی۔ اپنی پیدائش میں جس قدر دخل کسی انسان کو ہو سکتا ہے بس اتنا ہی مجھے بھی تھا۔ رہی سہی کسر مختار علی خان نام رکھ کر پوری کر دی گئی''۔

بچپن، نقلِ مکانی اور ہجرت کے کرب کو ہم آمیز کرتے ہوئے انھوں نے اپنی سرگزشت میں لکھا ہے:

''جب ہوش سنبھالا تو زمین و آسمان بدلے ہوئے تھے۔ نہ وہ خوش گپیاں تھیں نہ وہ خوش فکریاں صرف ایک ملازمت کا راستہ تھا چنانچہ ہمت کر کے مقابلہ کے امتحان میں بیٹھا۔ یہ امتحان میری زندگی کا دوسرا عظیم سانحہ ہے۔ اس میں کچھ میری حماقت، کچھ پرچے جانچنے والوں کی عقل مندی کہ میں پاس ہوگیا۔ امتحانی پرچے میں پاس ہونے کے بعد اگلا مرحلہ زبانی انٹرویو تھا جس میں نفسیات کا تجزیہ کرنے کے لیے انگلستان سے ماہرِ نفسیات بلائے گئے---''۔

شاعری کے میدان میں قدم جماتے ہوئے مختار علی خاں نے جب تخلص پرتوؔ کے ساتھ روہیلہ کو بھی منسلک کیا تو اِس کے پسِ پُشت اُن کا وہ خاندانی پس منظر تھا جس کا براہ راست تعلق روہیل کھنڈ کے حکمراں سے تھا۔ اس خاندانی پس منظر پر شان الحق حقی نے روشنی ڈالی ہے جس کی وضاحت کا یہ موقع نہیں البتہ پرتوؔ روہیلہ کی بیاض کے تمہیدی جملے ملاحظہ ہوں:

''میرے مورثِ اعلیٰ نواب حافظ رحمت خان لقب بہ حافظ الملک والیٔ روہیل کھنڈ صوبہ سرحد سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان آئے تھے اور انھوں نے روہیل کھنڈ میں پٹھانوں کی علیحدہ سلطنت قائم کی تھی---''۔

پرتوؔ روہیلہ اپنے بزرگوں کے صفات و کمالات کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مردان سے وسطی ہندوستان آئے اور روہیل کھنڈ میں سالہا سال حکمرانی کرتے رہے۔ اس دلچسپ بیان میں نہ صرف عہدِ مغلیہ کے عروج و زوال کی کہانی جھلکتی ہے بلکہ اُس کا تاریخ اور تہذیب سے بھی گہرا تعلق اُجاگر ہوتا ہے جس میں اُن کے بزرگوں کی اولوالعزمی کے ساتھ ذہانت اور علم دوستی بھی جلوہ گر ہے۔ انھوں نے پٹھانوں، خصوصاً یوسف زئی کا ذکر طنزِ ملیح کے انداز میں مختلف اشعار میں کیا ہے۔ اپنے کئی دوہوں میں بھی اس کے واضح اشارے کیے ہیں ؎

گیانی ہو کر کرتے ہو تم اگیانی کی بات
میں ہوں رحمت خاں کا پوتا اونچی میری ذات

اس کو دیکھو دادا جس کے حافظ رحمت خان
لوگوں سے وہ کہتا پھرے کیا سید، شیخ ، پٹھان

ذہین طالب علم ایک اچھا آفیسر بھی ثابت ہوتا ہے۔ وہ ۱۹۵۷ء میں پاکستان کے مقابلہ جاتی امتحان ٹیکزیشن سروس میں پاس ہوئے۔ اگلے سال ڈیرہ اسماعیل خاں میں سرکاری افسر کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں صوبہ سرحد کے ایک معروف خانوادے میں شادی ہوئی۔ ۱۹۸۳ء میں ڈائریکٹر و یجیلنس کسٹمز، ۱۹۸۵ء میں ڈائریکٹر جنرل، ۱۹۹۰ء میں ریجنل انکم ٹیکس کمشنر ہوئے۔ ۱۹۹۵ء میں سینٹرل بورڈ آف ریونیو سے ریٹائر ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اسلام آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور پوری یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ اپنے آپ کو ادب کے لیے وقف کر دیا۔

''پرتوِ شب'' اُن کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ غزلوں کا دوسرا مجموعہ ''شکستِ رنگ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ۱۹۷۶ء میں تین حصّوں پر مشتمل دوہوں کا مجموعہ ''رین اجیارا'' شائع ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں پشتو شاعری پر مرکوز مجموعہ ''پچے'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ۱۹۸۲ میں رائٹرس گلڈ کی طرف سے علاقائی ادب کے لیے اسے منتخب کرتے ہوئے ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں غزلوں، نظموں اور دوہوں کا مجموعہ ''نوائے شب'' شائع ہوا جس پر ۱۹۸۶ء میں اکیڈمی ادبیات اسلام آباد نے 'ہجرہ ایوارڈ' دیا۔ ''دامِ خیال'' اور ''آواز'' یکے بعد دیگرے شائع ہوئے اور ۱۹۹۳ء میں انعامات سے سرفراز کیے گئے۔ ۱۹۹۶ء میں نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ''سفر دائروں کا'' شائع ہوا۔ اسی زمانے میں انھوں نے فارسی میں ''کلیاتِ عطا'' سے بھی قاری کو واقف کرایا، اور اپنا سفرنامۂ امریکہ ''سفر گشت'' کے عنوان سے پیش کیا۔ ۲۰۰۰ء میں ''باغِ دودٗ'' میں شامل غالبؔ کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ شائع کرایا۔ ۲۰۰۵ء میں ''متفرقاتِ غالبؔ'' ۲۰۰۸ء میں ''انتہائے شب'' ۲۰۱۲ء میں غالبؔ اور غمگینؔ کے فارسی مکتوبات کی اشاعت نے ادبی حلقے میں ہلچل پیدا کر دی۔

ادبی ذوق وشوق کا مظاہرہ طالب علمی کے زمانے سے ہوتا ہے۔ممتاز مفتی نے اُن کی شخصیت اور فن پر اپنے مبسوط مضمون ''پرتؔو روہیلہ'' میں لکھا ہے کہ:

''--- جب میں نے پہلی بار پرتؔو کے دوہے پڑھے تو میرے روبہ رو بیراگ اور تیاگ بھرا ایک سادھو آ کھڑا ہوا''۔(ص:۳۶۲)

احمد ندیم قاسمی، جیلانی کامران اور محسن احسان نے ''شعر و حکمت'' (دور سوم، کتاب ۲،۳) میں اُن کی فنکارانہ صلاحیت کو مختلف زاویوں سے اُجاگر کیا ہے۔حمد، نعت، غزل، نظم، دوہے اور سفرنامے کے علاوہ مترجم اور محقق کی حیثیت سے بھی انھوں نے انفرادیت حاصل کی ہے۔ملک اور بیرونِ ملک انھیں درجنوں انعامات و اعزازات سے نوازا گیا ہے۔پشاور یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔کئی طالب علم ان کی ادبی خدمات پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔وہ جمیل جالبی سے خاص عقیدت و محبت رکھتے اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے۔

عمر کے آخری پڑاؤ میں انھوں نے غالبؔ کے فارسی مکتوبات کے تراجم کو اپنی بھرپور توجہ کا ہدف بنالیا تھا۔اُن کے اس عظیم الشان کام سے متعلق جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''ترجمہ طبع زاد تحریر سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔اس میں اصل کام یہ ہے کہ ترجمہ لفظی بھی ہو اور روزمرہ و محاورے کے عین مطابق بھی۔ساتھ ہی وہ رواں بھی ہو اور آپ اس کو ایسے پڑھ سکیں گویا مصنف نے اسے اسی زبان میں لکھا تھا جس میں مترجم نے ترجمہ کیا ہے۔پرتؔو روہیلہ نے اس کام کو جس توجہ، محنت اور لگن سے کیا ہے یقیناً داد و تحسین کے لائق ہے۔یہ ایک پہاڑ جیسا کام تھا جس کو انھوں نے گیارہ بارہ سال کی مسلسل محنت اور بڑے سلیقے کے ساتھ کر دکھایا ہے۔یہاں ایک بات میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ترجمے میں وہی بات جو غالبؔ نے فارسی میں کہی تھی، مترجم نے اسی شان و شوکت اور سبھاؤ کے ساتھ اُردو میں منتقل کر دی ہے اور یہ واقعتاً ترجمے کے میدان میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔میں پرتؔو روہیلہ کو ادب کے اس عظیم کارنامے کی تکمیل پر کھڑے ہو کر سلام کرتا ہوں۔اگر غالبؔ

زندہ ہوتے تو وہ بھی ایسے ہی الفاظ میں داد دے کر پرتوؔ روہیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا لیتے۔ فارسی مکاتیب کے اس دل کش اور سحر انگیز اُردو ترجمہ نے ادب عالیہ کا وہ بند دروازہ کھول دیا ہے جو ڈیڑھ سو سال سے تشنگانِ ادب پر بالعموم اور اردو والوں پر بالخصوص مقفل پڑا تھا اور اب اپنے اس کام کی بدولت غالب کے ساتھ پرتوؔ روہیلہ بھی ہمیشہ زندہ رہنے والوں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں''۔(فلیپ ،کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالبؔ)

غالبؔ کے فارسی مکتوبات کی جانب پرتوؔ روہیلہ کی طبیعت ایسی ملتفت ہوئی کہ واقعی دس بارہ برس کی مسلسل جدوجہد رنگ لائی۔ ۲۰۰۴ء میں ''پنج آہنگ'' کو ''آہنگِ پنجم'' کے عنوان سے اور ۲۰۰۶ء میں غالبؔ کے منتخب فارسی مکتوبات کو اردو کا جامہ عطا کیا۔ ۲۰۰۹ء میں غالبؔ کے منتخب فارسی مکتوبات کے ترجمہ کے ساتھ مکتوب الیہم کے حالاتِ زندگی اور مکتوبات کا فارسی متن بھی قاری کی سہولت کے لیے پیش کیا۔ ۲۰۱۰ء میں شائع ہونے والی 'کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالبؔ' اُن کی کاوش کا ہی نہیں، اعلیٰ فارسی دانی کا بھی ثبوت ہے۔ پروفیسر مشفق خواجہ کے الفاظ میں:

''پرتوؔ روہیلہ نے غالب شناسی کے لیے جو مشکل اور دشوار گزار راستہ اختیار کیا ہے اور اس پر وہ جس سلامت روی سے گامزن ہیں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ایک ایسے دور میں جب ہماری علمی، ادبی اور مجلسی زندگی سے فارسی کا تعلق برائے نام بھی نہیں اور غالبؔ کے فارسی خطوں سے استفادہ کرنا تو کجا ان کو جزوی طور پر سمجھنا بھی محال ہے، پرتوؔ روہیلہ نے غالبؔ کے فارسی خطوط کو پے در پے ترجمہ کر کے غالبؔ اور پرستاران غالبؔ کے درمیان اجنبیت کی فضا کم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس ترجمے کے ذریعہ اُردو والوں کو پہلی مرتبہ اس فضا میں سانس لینے کا موقع ملے گا جو غالبؔ نے ان خطوط کو فارسی میں لکھتے وقت تخلیق کیا تھا۔ پرتوؔ روہیلہ فارسی زبان پر ماہرانہ دست رس رکھنے کے ساتھ ساتھ غالبؔ کے مزاج داں بھی ہیں۔ اسی لیے انھوں نے انشائے غالبؔ کو منشائے

غالبؔ کے مطابق اس طرح اُردو میں منتقل کیا ہے کہ ترجمے پر تخلیق کا گمان
ہوتا ہے''۔(فلیپ ،کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالبؔ)

غالبؔ کے وہ شروع سے قائل تھے۔ سید اکبر علی ترمذی اور پروفیسر لطیف الزماں خاں کے کام سے انہیں غالبؔ کے فارسی مکتوبات کے تراجم کی تحریک ملی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ ۲۰۰۵ء میں جب غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے دعوت نامہ پر بین الاقوامی سمینار بہ عنوان ''غالبؔ کی تفہیم و تعبیر کے امکانات'' منعقدہ ۱۶/تا ۱۸/دسمبر ۲۰۰۵ء میں شرکت کے لیے حاضر ہوا تو دہلی میں غالبؔ پر مختلف زبانوں میں ہونے والے کام اور اسٹیج پروگرام سے اس حد تک متاثر ہوا کہ مستقبل کے تمام تحریری خاکے ذہن میں مرتب کر لیے۔ وہ ''غالبؔ کے منتخب فارسی مکتوبات'' (مطبوعہ ۲۰۰۶ء) میں لکھتے ہیں:

''غالبؔ کے فارسی مکتوبات کا انتخاب تو میرے ذہن میں عرصے سے جاگزیں تھا۔ یکسوئی کے اوقات میں کئی کتابوں کے خطوط خاص طور پر اسی مقصد کے لیے نشان زد بھی کیے تھے۔ البتہ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی کے سمینار منعقدہ دسمبر ۲۰۰۵ء میں مکرمی صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب سے ملاقات پر ان کی پرزور فرمائش نے اس منصوبے کو یکدم مہمیز کر دیا اور دہلی سے واپس آتے ہی میں اس منصوبے کی تکمیل پر جُٹ گیا۔ منصوبہ کا خاکہ پہلے ہی سے ذہن میں تھا۔ ترجمہ شدہ مکتوبات سے نشان زدہ کو یکجا کرنا چنداں مسئلہ نہ تھا۔ سو یہ کام بخیر و خوبی ہو گیا''۔ (ص:۱)

اِس شاندار کام کے منظر و پس منظر کو اُجاگر کرتے ہوئے پرتوؔ روہیلہ دیباچہ (واحد متکلم) میں لکھتے ہیں:

''غالبؔ کے فارسی مکتوبات اس کی فارسی شاعری کی طرح ایک جہانِ دِگر ہیں۔ آج سے تقریباً گیارہ بارہ سال بیشتر مرحوم و مغفور مشفق خواجہ صاحب کے اصرار پر میں نے اس قصرِ طلسمات میں قدم رکھا تھا اور آج کہ میں غالبؔ کے فارسی مکتوبات کی ساری کتابوں ہی کا نہیں بلکہ ان کے ایسے پراگندہ خطوط کا ترجمہ بھی کر چکا ہوں جو میری دسترس میں ہیں، بدستور اسی

قصر طلسمات میں ہر در و دیوار کو دیکھتا اور اس کے ایک ایک نقش کو حیرت سے تکتا، سرشاری کی کیفیت میں رواں ہوں اور باہر کا دروازہ نہیں مل رہا۔ قصرِ طلسمات کی تمثیل کو ذہن میں رکھا جائے تو اس انتخاب کو اس قصر طلسمات کا دیوانِ خاص ہی کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن پھر بھی مجھے اپنے بیان پر تشفی نہیں ہو رہی۔ الفاظ اپنے اظہار میں کس قدر کم مایہ اور تنگ ظرف ہیں اس کا احساس مجھے اس وقت ہو رہا ہے جب میں غالب کے اس عظیم وگراں قدر کارنامے کی تجلیل و توقیر میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اظہار کی ناکامی، تجسیم سے دل برداشتہ ہو کر تجرید کی جانب مائل ہے۔ سو اس انتخاب کو اگر حسنِ افکار کی خوشبو کہوں تو شاید بہتر ہو کہ چہرہ مقصود کچھ تو نمایاں اور رخِ مطلوب کچھ تو ظاہر ہو سکے''۔ (مطبوعہ ۲۰۰۶ء، ص:۱)

مذکورہ مجموعہ کی اہمیت، افادیت اور اولیت کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''میرے خیال میں غالبؔ کے فارسی مکتوبات کے تراجم کا یہ پہلا انتخاب ہوگا جو طبع ہو رہا تھا، ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ اب تک غالبؔ کے سارے فارسی مکتوب کا اردو ترجمہ ہوا نہیں تھا اور یقیناً اس کا یہی واحد سبب بھی ہے''۔

ماضی قریب و بعید کے ادبی منظر و پس منظر میں غالبؔ کو مکمل طور سے تلاش کرتے ہوئے خود ہی سوال کرتے ہیں کہ ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی ایسا کیوں نہیں ہوا؟ وہ محض سوال قائم نہیں کرتے بلکہ اشارتاً وقت کے بدلاؤ، مزاج و مذاق کی تبدیلی کو تاریخ کے پَرتَو میں منعکس کرتے ہیں:

''غالبؔ کے فارسی مکتوبات کا اردو ترجمہ اس لیے نہیں ہوا کہ عوام کا تو ذکر کیا، عرصہ ہوا فارسی علم و ادب ہمارے خواص کی دسترس سے بھی بغیر کسی احساسِ زیاں کے نکل گیا۔ البتہ غالبؔ کے اردو خطوط کے انتخابات مختلف اوقات میں گونا گوں مقاصد کی خاطر منظر عام پر آئے۔ ان میں علمی و ادبی مقاصد سے بڑھ کر تعلیمی و تدریسی مقاصد تھے اور اس لیے ان کے ایسے خطوط کا انتخاب کیا گیا جو عام زبان و روزمرہ میں دو۲ مخلص دوستوں

یا ملنے والوں کی باہم بول چال کے انداز کی عکاسی کرتا تھا کہ یہی اسلوب
ان کے اردو مکاتیب کا وصف اعلیٰ قرار پایا ہے''۔

اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک) میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری مرزا غالبؔ کے اردو خطوط کے تعلق سے جو رائے قائم کرتے ہیں، عموماً اردو میں اسی کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''غالبؔ کا فن یہ ہے کہ اس نے خط کو معلومات، احوال اور مزاج پرسی کی روایتی سطح سے بلند کر کے ایک منظر نامہ (Scenario) بنا دیا ہے۔ وہ محض سیدھے سادے معمولی انداز کے مطابق مکتوب الیہ کو مطلوبہ احوال سے باخبر نہیں کرتے بلکہ بالعموم احوال نامہ کو منظر نامہ میں بدل دیتے ہیں۔ وہ انسانی نفسیات اور سماجی تعلقات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا منظر نامہ تاثر، احساس اور جذبہ کی کئی کیفیات کو پیش کرتا ہے۔ ایک ماہر فن ڈرامہ نگار کی طرح وہ منظر کی جزئیات دکھانے میں قدرت رکھتے ہیں۔ بالخصوص انسانی تعلقات کے حوالے سے وہ جن جزئیات کو اُجاگر کرتے ہیں، وہ تہذیب وثقافت کی اقدار کا عکس پیش کرتی ہیں۔ ان کے خطوط میں ایسے مواقع پر ایک گہرے انس، محبت، قرابت اور دوستی کی جھلکیاں ملتی ہیں''
(دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۹ء، ایم، آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ص:۶۱۷-۶۲۷)

اس جانب توجہ ضرور مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ دیوان محمد علی کو لکھے گئے خطوط کا اسلوبیاتی مطالعہ کیا جائے تو ان میں بیان کا طنطنہ ہے، عالمانہ شان ہے، پیچیدہ اور پُر تکلف اظہار ہے۔ خیال آرائی، نکتہ آفرینی، رنگین بیانی ہے۔ بلکہ منظر نامہ وسیع اور دورانیہ بسیط ہے۔ اور یہ نکات تقابلی مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے لہٰذا فارسی اردو کے اندازِ تخاطب کے موازنے سے گریز کرتے ہوئے پرتو روہیلہ کی طرف واپس آتا ہوں۔ وہ غالبؔ کے ان فارسی خطوط کے اظہار بیان کو مختلف زاویوں سے پرکھتے ہوئے سوال وجواب کی کیفیت قائم کرتے ہیں:

''یہاں لامحالہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ فارسی مکتوبات تو غالبؔ کے

بہت سے پیش رووں اور معاصرین نے بھی بڑی شدّ و مد کے ساتھ لکھے
جب کہ ان میں سے کوئی علم و دانش اور فضل و کمال میں غالبؔ سے کسی طرح
کم نہ تھا لیکن ان کے مکتوبات شہرت کی اس بلندی کو کیوں نہ پہنچ سکے جو
غالبؔ کے مکتوبات کو مقدور ہوئی؟ اس کا ایک بڑا سیدھا سادہ اور مسکّت
جواب ہے اور وہ یہ کہ ہر شخص کو شخصیت نصیب نہیں ہوتی اور نہ ہر فرد کو
انفرادیت۔ غالبؔ کو قدرت نے وہ ذہن اور وہ دماغ دیا تھا جو قدرت کے
کارخانے سے بھی صدیوں میں شاذ ہی برآمد ہوتا ہے۔ غالبؔ اپنی شخصیت
اپنی انفرادیت اپنی علوئے فکر و بے مثل طباعی کا لازوال نمونہ تھے۔ وہ
شریعت ادب کے وہ رسول برحق تھے کہ جس کے ہاتھ میں لفظوں کے گونگے
پتھر بولنے لگتے اور بے جان چیز میں بھی جان پڑ جاتی''۔ (ص: ۲-۳)

مکتوب نگاری کے اصول و ضوابط اور اجزائے ترکیبی سے بحث کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون ''غالبؔ کی انشا نگاری و فارسی نامہ نویسی'' (بارے غالبؔ کا کچھ بیاں ہو جائے۔ مطبوعہ ۲۰۱۲ء، انجمن ترقیِ اردو پاکستان) میں وہ طرح طرح کے سوالات قائم کرتے ہوئے دعویٰ اور دلیل سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً غالبؔ کے دستور العمل مکتوب نگاری کب، کہاں اور کن حالات میں تحریر ہوا؟

اس حصہ میں وہ نواب علی بخش کی ستم ظریفی کو حوالہ بناتے اور غالبؔ کے ذہنی کیفیات کے مدّ و جزر کو اُبھارتے ہیں۔ پھر غالبؔ کے دستور العمل مکتوب نگاری کے اوامر و نواہی کو اُجاگر کرتے ہوئے قاری کی سات بنیادی نکات پر توجہ دلاتے ہیں:

''---غالب نے مندرجہ بالا ہر امر کے ساتھ اس کی نہی کو ممتنعات میں
شامل کیا ہے۔ ایک طریقے سے یہ اس ہی امر کی تشریح کے سوا کچھ نہیں۔
مثلاً اصول اوامر میں ہے کہ ایک ایسے لفظ سے کہ مکتوب الیہ کے حسب
حال ہے خطاب کیا جائے اور مدعا نگاری شروع کر دی جائے۔ یعنی اس
ضمن میں نہی یہ ہے کہ القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی سے کہ
حشو و زوائد میں آتے ہیں احتراز کیا جائے۔ دوسرے اوامر کے نواہی بھی

اسی طرح قیاس کیے جاسکتے ہیں''۔(غالبؔ کی انشاء نگاری و فارسی نامہ نویسی، ص: ۴۰-۴۱)

ایک اور عنوان قائم کرتے ہوئے پرتوؔ روہیلہ قاری کو اس جانب متوجہ کرتے ہیں کہ غالبؔ نے اپنے دستور العمل کی خود کس حد تک پیروی کی؟

''چوں کہ اس دستور العمل کی تکمیل اور علی بخش خاں کو اس کی تحویل کے فوراً بعد ہی غالبؔ نے سفر کلکتہ اختیار کیا تو اس مقصد کے لیے وہی خطوط جو اس سفر کے دوران اور قیام کلکتہ میں لکھے گئے انتہائی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ سارے خطوط بعنوان 'نامہائے فارسی غالبؔ' مرتبہ علی اکبر ترمذی و مطبوعہ غالبؔ اکیڈمی دہلی، کتاب کی شکل میں دستیاب بھی ہیں''۔

اِس بات کو مزید تفصیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مذکورہ بالا تالیف مکتوبات میں کل اکتیس خطوط ہیں۔ جس میں چوبیس خطوط باندے کے مولوی محمد علی خاں کے نام ہیں جو غالب کے دوست، ہمدرد، کرم فرما سب ہی کچھ تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم دستور العمل کی دوسری شقوں کی طرف متوجہ ہوں سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے پہلے واشگاف اعلان کی ''چوں کلک و ورق بہ کفِ گیرم مکتوب الیہ را بلفظے کہ فراخور او ست درسر آغاز صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنج مدعا مدعا گردم'' کہاں تک پیروی کی ہے۔ چنانچہ ان خطوط کے القابات کے جائزے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے چوبیں میں سے صرف پانچ میں اپنے دستور کی پیروی کی ہے جب کہ پندرہ میں صریح خلاف ورزی کی ہے''۔

اسلوبیاتی مطالعہ کرتے ہوئے وہ 'بارے غالبؔ کا کچھ بیاں ہو جائے'' میں رقم طراز ہیں:

''نہ صرف یہ کہ یہ تحریریں تقریر سے کوئی قرابت نہیں رکھتیں اکثر اس تحریر سے بھی بعید ہیں جن کا مقصد مدعا نگاری ہوتا ہے اور اگر اُن دو خطوط کو بھی جو صنعت تعلیل میں لکھے گئے ہیں نظر میں رکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ

غالبؔ نے خود ہی کیا ہے جس سے وہ بظاہر نفرت کا اعلان کرتے تھے کہ
یہ دونوں خطوط صریحاً بالنفس سوائے خود نمائی کے اور کسی زمرے میں نہیں
آتے۔ بلکہ ان خطوط کی نقل کو (یہ دو خطوط مولوی محمد فضل حق صاحب
اور لکھنؤ کے وزیر معتمد الدولہ کے نام تھے) محمد علی خاں کے خط میں ارسال
کرنا تو خود نمائی کا بھی تیسرا درجہ نظر آتا ہے''۔(ص:۴۱-۴۲)

اس طرح انھوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ غالبؔ کے دستور العملِ مکتوبات نگاری کا اُن کے اکثر فارسی خطوط پر اطلاق نہیں ہوتا ہے۔

پروفیسر معین الدین عقیل، پرتوؔ روہیلہ کے کام کو تنقیدی زاویے سے دیکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''غالبؔ کے فارسی مکاتیب اپنے اسلوب کے ساتھ ساتھ حکمت و دانائی
اور ادق فکری مباحث سے بھی لبریز ہیں۔ اس صورت حال میں کہ غالبؔ
کی 'مشکل پسندی' مسلّمہ ہے، فارسی میں تو یہ اور بھی گراں ہی نظر آتے
ہیں، جب کہ کلامِ غالبؔ کی شرحیں اور مکاتیبِ غالبؔ کے تراجم اب ہمارا
سہارا ہیں اور رہیں گے۔ اس اعتبار سے غالبؔ کے فارسی مکاتیب کے
اردو ترجمے بھی ہمارے لیے آج اور آئندہ ایک ایسا ماخذ رہیں گے جن
کے بغیر اصل نہ سہی، ایک ثانوی حیثیت میں، ہم غالبؔ کے حالات،
شخصیت اور فکر و فن اور ساتھ ہی غالبؔ کے عہد کے ماحول و معاشرے
کے بارے میں کوئی معیاری مطالعہ نہ کر سکیں گے''۔(دیباچہ، غالبؔ کے
منتخب فارسی مکتوبات، ص ۱۸)

معین الدین عقیل صاحب مکتوب نگاری کے نکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پہلو پر مزید روشنی ڈالتے ہیں:

''غالبؔ کے فارسی مکاتیب کے سب ہی مجموعوں کے اُردو تراجم ہماری
ضرورتوں کی تکمیل کے لیے موجود ہیں۔ اگرچہ متعدد فاضل مترجمین نے اپنی
قابلِ قدر لیاقت و استعداد سے یہ ترجمے کیے ہیں لیکن پرتوؔ روہیلہ ان میں

مختلف اور منفرد ہیں۔ایک امتیاز تو اُن کا یہی ہے کہ سارے ہی فارسی مکاتیب کو انھوں نے اردو میں منتقل کر دیا اور لگتا ہے کہ برسوں سے خود کو انھوں نے غالبؔ اور اس کے ان فارسی مکاتیب کے اردو ترجموں ہی کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ بنیادی طور پر تو وہ شاعر ہیں اور شاعری میں غزل کے ساتھ ساتھ دوہے اور پٹے کی تخلیقی جہات اردو کے علاوہ دیگر متعلقہ زبانوں کی شعری روایات سے ان کی واقفیت وآ گاہی کا ثبوت ہے، لیکن ان سے بڑھ کر فارسی زبان اور اس کی علمی ولسانی خصوصیات سے کامل واقفیت بھی ایک نمایاں جوہر ہے جو تواتر کے ساتھ ان کے اِن تراجم کے ذریعے سامنے آئی ہے"۔(دیباچہ، غالبؔ کے منتخب فارسی مکتوبات مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ص:۱۸-۱۹)

وہ اُن کے ایثار، یکسوئی اور تن دہی کی تعریف کرتے ہوئے غالبؔ کے خطوط کی زبان و بیان پر رقم طراز ہیں:

"غالبؔ کے فارسی مکاتیب کے اسلوب اور زبان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے...وہ غلط نہیں کہ غالبؔ نے ان کے لیے بہت پختہ اور بلیغ اسلوب اختیار کیا ہے، جس کا سمجھنا یا مطالب کی وسعت وتہہ تک پہنچنا کچھ آسان، بلکہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔اس مناسبت سے ان کا ترجمہ بڑی لیاقت و مہارت، توجہ اور ذمے داری کا متقاضی ہے۔ یہ ہفت خواں پرتؔو روہیلہ صاحب نے بڑی کامیابی یا حیران کن بلکہ مرعوب کن حد تک سر کیا ہے۔ان کی زبان سلجھی ہوئی، صاف، واضح اور رواں ہے۔انھوں نے مفہوم کی درست تفہیم اور زبان کو رواں بنانے کے لیے جو اہتمام کیا ہے وہ لائقِ ستائش ہے۔اس مقصد کے لیے جگہ جگہ، بلکہ ہر مقام پر قوسین ہیں انھوں نے حرفِ ربط، حرفِ جار وغیرہ کا اضافہ کر کے فارسی کے فطری اسلوب و اظہار کو اردو سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ضروری یا فارسی متن سے محو الفاظ یا بین السطوری مفہوم کی مفاہمت سے ضروری الفاظ کو بھی

اردو مترادفات کے اضافوں کے ذریعے جملے کو مربوط اور بامعنی بنانے کی خاص کوشش کی ہے، جو بہت نمایاں اور واضح ہے۔ دیانت دارانہ اور مطابق اصل ترجمے کی یہ بہت عمدہ مثال ہے۔ یہ اہتمام ترجمے کی صحت اور معیار واستفادے کے لیے ضروری تھا۔ ان صفات کے باعث پرتوؔ روہیلہ صاحب کے ان تراجم کو مستند اور معیاری کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا''۔ (ص:۱۹-۲۰)

غالبؔ کے طرز اظہار پر مدلل گفتگو کرتے ہوئے معین الدین عقیل صاحب پرتوؔ روہیلہ کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالتے ہیں:

''غالبؔ کے تقریباً تمام ہی دستیاب فارسی مکتوبات کا ترجمہ غالبؔ سے ان کی محبت وانسیت اور ذہنی وابستگی کا مظہر ہے۔ اس قرب وموانست کا شاید ایک اثر ان کے اپنے اسلوب پر بھی نمایاں ہونے لگا ہے۔ خود جس طرح کی نثر اب روہیلہ صاحب لکھنے لگے ہیں، الفاظ کا جو دل نشین، مناسب اور برمحل انتخاب اب ان کی نثر میں نمایاں ہوگیا ہے اور جس احتیاط ونزاکت کا لحاظ ان کے انتخابِ الفاظ اور جملوں کی ساخت میں ہونے لگا ہے اسے غالبؔ کے اسلوب کا اثر کہا جائے تو شاید نامناسب نہ ہوگا۔ گویا وہ اب مغلوبِ غالب نظر آنے لگے ہیں --- اُن کے یہ تراجم بظاہر غالبؔ کے خیالات کو صحت و دیانت کے ساتھ ہم تک پہنچاتے ہیں اور مطالعہ غالب کی ایک ناگزیر ضرورت کی تکمیل کرتے ہیں، لیکن ان کے تحریر کردہ مقدمات اور ایک حد تک تعلیقات (رجال) بھی اس ضمن میں ایک اضافہ وافادہ ہیں۔ غالبؔ شناسی میں اور غالبؔ شناسی کے لیے دونوں صورتوں میں، روہیلہ صاحب کی خدمات یادگار رہیں گی''۔ (غالبؔ کے منتخب فارسی مکتوبات، ص:۲۱)

پرتوؔ روہیلہ کی گراں قدر خدمات کا اعتراف تقریباً تمام محققین، ناقدین اور مترجمین نے کیا

ہے میں اپنی بات کو ختم کرنے سے پہلے پروفیسر جمیل الدین عالی کی یہ رائے بھی پیش کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے پرتو روہیلہ کی کتاب ''بارے غالب کا کچھ بیان ہوجائے'' کے دیباچہ میں 'حرفے چند' کے عنوان سے لکھی ہے:

> ''---جناب پرتو روہیلہ ایک نغز گو شاعر، دوہا نگار، سفرنامہ نویس کی حیثیت سے تو معروف تھے ہی لیکن اِدھر چند برسوں سے انھوں نے غالب شناسی کے میدان میں خصوصاً غالب کے مکاتیب فارسی کے تراجم وتدوین کے ضمن میں جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین وستائش ہیں۔ پاک وہند میں یکساں طور پر جناب پرتو روہیلہ کی ان کاوشوں کو سراہا جارہا ہے۔اسی سلسلے کی ایک کڑی ''بارے غالب کا کچھ بیاں ہوجائے'' ہے--- پرتو روہیلہ کی اس کتاب میں اُن کے متفرق تحقیقی وتنقیدی مضامین شامل ہیں جن سے غالب شناسی کے کئی رُخ سامنے آتے ہیں اور اس باب میں پائے جانے والے کئی اشکالات کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے''۔

(بارے غالب کا کچھ بیاں ہوجائے- پرتو روہیلہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۲ء)

علامہ راشد الخیری نے ۱۹۳۵ء میں ادیبوں کے سوانحی کوائف کا ذکر کرتے ہوئے 'عصمت' کے سالنامے میں لکھا تھا کہ ستمبر کا مہینہ عموماً ستم ڈھاتا ہے۔ واقعی اس نے ۲۹ر ستمبر ۲۰۱۶ء کو اسلام آباد میں غالب کے اِس شیدائی پر بھی ستم ڈھایا اور اُنھیں ۸۳ر برس کی عمر میں ہم سے چھین لیا ورنہ کج کُلا ہی شان کا یہ روہیلہ پٹھان ادب میں بہت سے مرحلوں کو سر کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ تاہم جاتے جاتے غالب کے فارسی خطوط پر جو مبسوط اور منظّم کام کر گئے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بلاشبہ پرتو روہیلہ کو شخصیت بھی نصیب ہوئی اور انفرادیت بھی میسّر آئی ہے۔

○○○

کتابیات

☆ باندہ اور غالبؔ، مرتبہ: صالحہ بیگم قریشی، برگ اکادمی، چھاؤنی، باندہ، ۱۹۹۴ء

☆ بارے غالبؔ کا کچھ بیاں ہوجائے، پرتو روہیلہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۲ء

☆ بھوپال اور غالب، عبدالقوی دسنوی، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال، فروری ۱۹۶۹ء

☆ بجنوری بحیثیت ناقد غالبؔ، ڈاکٹر شمس بدایونی (لکچر سیریز)، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۹۷ء

☆ تفہیمِ غالب کے مدارج، ڈاکٹر شمس بدایونی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء

☆ تلمیحات غالب، پروفیسر شریف حسین قاسمی، رامپور رضا لائبریری، مئی ۲۰۱۸ء

☆ تاریخ بندیل کھنڈ، سید محمد الیاس مغربی، برگ اکیڈمی، باندہ، ۱۹۷۸ء

☆ خطوط رشید احمد صدیقی، جلد پنجم، مرتبین مہر الٰہی ندیم، لطیف الزماں خاں، ملتان آرٹس فورم، ملتان، ۲۰۲۰ء

☆ دیوانِ غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء

☆ دیوانِ غالب، مرتبہ: کالی داس گپتا رضا، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت چہارم، ۲۰۱۲ء

☆ دیوانِ غالب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۳ء

☆ روح غالب، مرتبہ: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، افضل برقی پریس حیدرآباد، طبع دوم، ۱۹۵۰ء

☆ شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا، ترتیب وتہذیب: شاکر حسین شاکر، ابرار عبدالسلام، کتاب نگر حسن آرکیڈ ملتان کینٹ، ۲۰۱۵ء

☆ شرحِ دیوانِ غالب، حسرت موہانی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۹ء

☆ شرحِ دیوانِ غالب، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۲ء

☆ عارفِ خستہ کے بغیر، مرتب: ڈاکٹر ابرار عبدالسلام، بیکن بکس، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۶ء

☆ عکسِ غالب، مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء

☆ عیار غالب، مرتب: مالک رام، علمی مجلس، دلی ۶، فروری ۱۹۶۹ء

☆ غالب اور غالبیات، عبدالحق، کنگروے کیمپ، دہلی، دسمبر ۲۰۱۶ء

☆ غالب کے فارسی خطوط، پروفیسر حنیف نقوی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء

☆ غالبؔ کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ۔ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء

☆ غالب، جہان دیگر، حامدی کاشمیری، راجباغ، سری نگر، کشمیر، جنوری ۲۰۰۳ء

☆ غالب نامہ (آثارِ غالب)، شیخ محمد اکرام، احسان بک ڈپو لکھنؤ نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے چھپوا کر شائع کیا۔

☆ غالبؔ ببلیوگرافی، مرتب: ڈاکٹر محمد انصار اللہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۴ء

☆ غالب کے منتخب فارسی مکتوبات (اردو ترجمہ)، پرتو روہیلہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء
☆ غالب کے منتخب فارسی مکتوبات، (اردو ترجمہ اور فارسی متن) مرتب و مترجم: پرتو روہیلہ، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
☆ غالبیات (زمانہ کی ۲۲ویں جلد)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۴ء
☆ غالب اور راجستھان، شاہد احمد جمالی، راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور، ۲۰۱۶ء
☆ غالب کی نئی دنیا، محمد مستقیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء
☆ غالب کی شخصیت اور شاعری، رشید احمد صدیقی، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، (نظام خطبات)، ۱۹۷۸ء
☆ غالب بصد انداز (غالب پر ریڈیائی تحریریں)، ڈاکٹر محمد شکیل اختر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۸ء
☆ غالب اور اس کی شاعری، احمد الدین احمد، اردو رائٹرس گلڈ، الہٰ آباد، ۱۹۹۶ء
☆ غالبؔ۔ کالی داس گپتا رضاؔ، ناشر مصنف، ۱۹۹۸ء
☆ غالب شناسی، ڈاکٹر چمن لعل بھگت، میزان پبلشرز، سری نگر، کشمیر، ۲۰۱۰ء
☆ فیضانِ غالب، جمیل مظہری، ترتیب و تعارف۔ محمد رضا کاظمی، الفاظ فاؤنڈیشن، کراچی، ۲۰۱۴ء
☆ فرہنگِ لفظیاتِ غالبؔ، سلیم شہزاد، منظر نما پبلشرز، مالیگاؤں، جنوری ۲۰۱۱ء
☆ کلکتہ کے قدیم اُردو مطابع اور اُن کی مطبوعات-ایک جائزہ، سید مقیت حسین، عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ، ۱۹۸۲ء
☆ کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالب، مترجم و مرتب پرتو روہیلہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء
☆ مکتوباتِ غالب، لطیف الزماں خان، الفیصل، اردو بازار، لاہور، دسمبر ۱۹۹۵ء
☆ مرزا اسد اللہ خاں غالب (مونوگراف)، پروفیسر شہزاد انجم، مغربی بنگال اردو اکادمی، کولکاتا، ۲۰۲۰ء
☆ A treatise on the Music of Hindoostan, by N. Augustus Willards, Baptist Press, Kalkata, 1834
☆ A Short History of the World, H.G. Wells, The Bodley Head, Penguin, Books.
☆ Indian Philosophy in Modern times V. Brodov (Traslation by Russian), Progress Publishers, 1984
☆ Persian Letters of Ghalib, Syed A.A. Tirmizi, Asia Publishing House, 1969
☆ संस्कृत साहित्य का इतिहास, डा. दयालशंकर शास्त्री, भारतीय प्रकाशन, चौक, कानपुर–1978
☆ संस्कृत साहित्य का सरल इतिहास, डा. ईश्वरदत्त शील, प्रकाशन उच्योग, लखीमपुर खीरी, 1983
☆ ''تحریر''، دہلی، سہ ماہی، رسالہ، مرتب مالک رام، جولائی تا ستمبر ۱۹۷۱ء
☆ ''تحریر''، دہلی، سہ ماہی، رسالہ، مرتب مالک رام، جولائی تا ستمبر جون ۱۹۷۷ء
☆ ''شبستان'' اردو ڈائجسٹ، نئی دہلی، غالب نمبر ۱۹۶۹ء
☆ نقد و نظر، علی گڑھ، غالب نمبر، ۱۹۹۷ء، جلد نمبر ۱۹، شمارہ ۲،
☆ ''بازیافت'' شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، ۲۰۰۲ء
☆ ''ایوانِ اردو'' دہلی، گوشہ غالب، فروری ۲۰۲۰ء
☆ ''آج کل''، دہلی، گوشۂ غالب، فروری ۲۰۲۰ء

GHALIB, BANDA AUR DIWAN MOHD. ALI

by

Saghir Afraheim

پروفیسر صغیر افراہیم نے غالبؔ کے ایک ایسے مکتوب الیہ کا تفصیلی ذکر مستند تحقیقی شواہد کے ساتھ کیا ہے جن سے متعلق اطلاعات کا افسوسناک حد تک فقدان ہے۔ غالبؔ نے سفر کلکتہ کے دوران باندہ میں چھ ماہ قیام کیا اور ان کے میزبان دیوان محمد علی تھے جن کے نام ان کے 37 فارسی خطوط ہیں۔ ان خطوط سے منکشف ہوتا ہے کہ غالبؔ دیوان محمد علی کو کس درجہ عزیز رکھتے تھے اور دیوان محمد علی نے غالبؔ کی اعانت کی اور کلکتہ میں پینشن کی حصولی میں ان کی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

پروفیسر صغیر افراہیم کی کتاب نہ صرف دیوان محمد علی سے متعلق معلومات کے فقدان کو تحقیقی دقتِ نظری کے ساتھ پورا کرتی ہے بلکہ غالبؔ کے قیام لکھنؤ، کانپور اور باندہ سے متعلق دستیاب تفصیلات کو Cross Check بھی کرتی ہے اور بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرتی ہے۔ دیوان محمد علی کمپنی کے ملازم تھے، نواب باندہ سے ان کے مراسم تھے، غالبؔ سے ان ملاقات کی تفصیل نہ تو مالک رام نے درج کی ہے اور نہ خلیق انجم نے۔ دونوں نے عمومی باتیں لکھیں۔ اس سلسلے میں صغیر افریہم نے اہم تاریخی ماخذوں کو کھنگالا اور حتمی طور پر لکھا ہے۔

مندرجات کی معروضیت، تحقیقی استدلال، مقدمات کی تدوین اور نتائج کے استخراج میں تحقیقی دقتِ نظری کے باعث یہ کتاب ممتاز ادیب اور معروف نقاد صغیر افریہم کو ذمہ دار محققوں کی صف میں بھی شامل کر دیتی ہے جس کی پذیرائی لازمی ہے۔

شافع قدوائی

Opposite Blind School, Qila Road, Shamshad Market, Aligarh-202001
Mob: +91-9818897975, Ph:0571 2700088
E-mail: bbpublication@gmail.com
Website: www.brownbooks.in

₹ 400/-

ISBN: 978-93-90167-76-0